

ایسور کا جو دہریا

(پچھلے آپ نے کیا کچھ جانتے تھے؟)

ایسور کا جو دہریا

لاہور کا جو ذکر کیا

لاہور کا جو ذکر کیا

(کچھ آپ بیتی کچھ جگ بیتی)

گروپال مشعل

ہاشم

مکتبہ تحریک، ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، لاہور

نہ پوچھ حال میں وہ چوب خشک صحرا ہوں
 لگا کے آگ جسے قافلہ روانہ ہوا
 (آتش)

پہلی بار : ۱۹۶۱ء
 قیمت : چھ روپے
 کتابت : حشمت علی
 طبع : یونیورسٹی پریس، دہلی

جریدہ جاری کر دیا۔ خاص یہ کہ بیکاری کا یہ علاج بیکاری سے دور تھا اور جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہو گا اس کا انجام غیر خیر نہیں ہوا۔

لہذا نئے پہنچ کر کارنامہ کے نام سے ڈیپارٹمنٹ داخل کر تو دو پختہ ملک اس کا کوئی جواب ہی نہیں آیا کسی دیکھنے سے تعلق و فرنگ رسائی نامہ اس کی تو معلوم ہو گا کسی، آئی، ڈی نے اپنی حقیقت کے سلسلے میں یہ گھوڑا تھا کہ درخواست کنندہ ریاست مالیر کوٹہ کا باشندہ ہے اس لیے کاغذات ریاست کو بھیج دیے گئے ہیں یہ سننے پر اس نے گھوڑا کو درخواست داخل و دست برداری کیونکہ جواب مالیر کوٹہ کا اخباروں سے سخت وحشت مآبی اور یہ بات کو نہیں گوارا ہوئی نہیں تھی مگر ان کی مدد یا کوئی فرد اخبار نویس جیسے خطرناک شخص کو اختیار کرے۔ بہر حال آخری کو شش کو دیکھنے کے خیال سے میں مالیر کوٹہ گیا اور شیخ بشیر حسن صاحب بشیر سے ملا بشیر صاحب ان دنوں اپنے خاندانی امور کے طریقے تھے وہ متاع کوئی تھے اور شاہنواز بھی۔ میرے ساتھ ان کے تعلقات تھے کہ اپنے تھے۔ پیشتر اس کے کہ میں کچھ کتابت انھوں نے خود ہی کی تھی جاوید میری درخواست ان کے پاس آچکی ہے اور میری بھی کچھ اس پر کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ چنانچہ کوٹہ پھر شیخ دینے سے روکا نہیں جائے گا لیکن کاغذات بھی وہاں نہیں کیے جائیں گے۔ بات حیرت چرچہ کاغذات شیخ سلج پر چلی تھی اس لیے اخبار نویس تھے کہ میں اسے ان کی پیش کش کا عنوان نہ بناؤں گا۔ بہر گز میری ریاست سے باہر جھگڑا ہوا میرے گھر والے تو وہیں موجود تھے۔

لہذا نئے پہنچ کر مقامی دو مسئلہ سے شغول ہوئے۔ طے پا کر کارنامہ

۲۴ مئی ۱۹۰۳ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کر لیا تو سوال یہ پیدا ہوا کہ اب کیا کیا جائے؟ نواز صاحب ملی میں میں کالج کی بزم ادب کا سرگرمی تھا اور ہندوئی کتب سے کہیں نہ رہا وہ تو بہر حال شاعری پر صرف ہوتی تھا پھر مجھے بہت کچھ لکھنے کا بھی چاہ تھا اور بس یہی سرگرمیوں میں بھی مشغول رہتا رہتا رہتا تھا۔ لہذا میرے ادب اور شاعری سے کچھ ایسی نہ ملے، واقفیت ہو گئی تھی لیکن ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی شخص بھی معاشرہ کے معاملے میں مفید نہیں ہو سکتا تھا۔

امتحان دینے کے بعد اپنے وطن مالیر کوٹہ میں دو سال شاعری اور بیکاری میں گزار گئے۔ پر جامعہ ملٹری کی سرگرمیوں میں بھی شرکت بڑھانے لگی۔ گھر والوں کو یہ بیکاری اور شاعری سے کہیں زیادہ اس بات پر توجہ دلانی تھی اور یہ کہ جیسا بھی نہیں گئی، ایک مطلق انسان ریاست میں کیا نہیں ہو سکتا تھا۔

جائے داخلہ نہ رہی تو پڑے رفتی کو جنس ہوئی تھی تو اہمیت روپیہ ہو فرما ہم کر سکا جیسا میں ڈاکٹر اور لہذا نئے پہنچ گیا اس خیال سے کہ وہاں سے ایک ادبی

لے پر جانڈال کی تحریک ہندوستانی ریاستوں میں کانگریس کی متبادل تحریک تھی۔

کے لائیکر لٹن کی درخواست کو دیکھ کر چھوڑ دیا مائے، مہیجی آئینہ کے نام سے نئے لائیکر لٹن کی درخواست دی جائے اور یہ درخواست کسی مقامی شخص کی طرف سے دی جائے۔ یہ درخواست منظور صاحب کی طرف سے دی گئی جو مقامی نظروں میں ایک معزز شخص تھے۔ لہذا اور خواست ایک ہی جتنے میں منظور ہو گئی۔

منصور بہت اچھی منزل کہتے تھے اور شعروادب یا منصور میں غزل پڑھتی ناقدانہ نظر رکھتے تھے۔ مہیجی آئینہ کے پہلے شمارے میں انھوں نے عالی کی غزل کوئی پرچہ مضمون لکھا تھا وہ بہت پسند کیا گیا تھا منصور کے علاوہ جو دوستوں کا دعویٰ ہے میں قریب حاصل ہوا ان میں نظیر حسین خاں نظیر و حیدر کی بالکل مدح و تحسین اور ایم جی لطیفی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نظیر و حیدر کی اور غرض تسلیاتی نے دفتر اور کمپنیشن کے لیے مجھے اپنے قریب ہی ملنے والی گئی، ان کے ایک کو ملے پر غرض کا گھر تھا اور دوسرے کو ملے پر نظیر کا۔ نظیر و حیدر ان کی حیثیت سے میرے شریک ادارت بھی تھے اور انھیں ہے کہ انھوں نے میری سرگرمیوں کی۔

”مہیجی آئینہ کا پہلا شمارہ ادب و شعر سے دلچسپی رکھنے والوں کو پسند آیا اور اسے آخر شبانی اور دوسرے اصحاب نے بھی اس کے لیے اچھا پزیرا بھیجا تھا انھیں اور سندھانی نے اس کے لیے خیر نصیحتیں دیں کہ ان کے لیے ایک کتاب

وادی ہے :

برخیضہ کہ گردوں بہ فراست محمدیہ
برخیضہ کہ رخ نمود مہیجی آئینہ
تا جو شخص زندہ رہے ہرگز دریشہ تو
برخیضہ و غور بادہ ز جام غور شہید

سب سے بڑی دلوں اس شمارے کی ہے لیکن کہ بابائے اردو نے سب سے اردو میں اس پر تبصرہ کیا جو اس کی طور پر تبصرہ اچھا تھا۔ البتہ وہ ایک مضامین کے طرز نگارش کا جو میری یا نظیر کی تصنیف نہیں تھے ہر بار اور غور قرار دیا گیا تھا تبصرے میں مہیجی آئینہ کے اراکین و قاصد پر بھی بحث تھا، پرچہ کا ایک مقصد یہ ہے کہ اردو زبان کا محفوظ و صیانت قرار دیا تھا بالکل اردو نے اس کا خیر قدم کیا تھا اور اس پر سرت کا اعتبار بھی کیا تھا کہ ابھی ایسے ہندو موجود ہیں جو اردو زبان کے محفوظ و صیانت میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

میں اس تبصرے پر بہت غرض تھا لیکن اپنے ہندو ہونے کا ذکر مجھے پسند نہیں آیا تھا کیونکہ زندگی اس طور پر گزرتی تھی کہ ان خطوبہ کو بھی سوجھ بوجھ نہیں تھا۔

اور میری اچھی اچھی اخباروں اور مجیدوں نے مہیجی آئینہ کے مضامین نقل کیے اور اس کی تعریف بھی کی لیکن مہیجی آئینہ کا پہلا شمارہ اس کا آخری شمارہ بھی تھا اس ایک شمارے کے لیے میں نے دعویٰ ہے میں نے غور یا تبصرہ ہی نہیں کیا تھا اس کی اشاعت پرچہ کا ایک ہندو میں نے نہیں سنا ہے کی علت سے کہ میں نے زیادہ میری کیفیت پر غور کر دیا تھا اس کی اشاعت کا سب سے پہلا سبب یہاں تو میری

کلیں استاذانہ کیلئے پیدا کیا تھا۔

ہرے کے لیے خود بھی کچا اور دوسرے لوگوں کے بھی اچھے مضافیں حاصل کر لیے لیکن اس کے انتظامی معاملات کا طرف تو روہنے کی بجائے فرصت نہیں خود بیشتر وقت جسم آرائیوں میں گزار جاتا۔ ہمدرد وقت بخل بھی رہتی تھی اور ضرورتاً ہنگام اور سنگرمٹ کا دور چلنے کو ساتھ لے جاتا تھا۔ ان دنوں ایسے کئی لوگ تھے جنہیں نیکو شخص کے سوا اور کوئی ٹھکانہ نہیں تھی اور وہ سب میرے دوست بن گئے تھے۔ ان دنوں میں چیتا بھی بہت تھا لیکن اس میں میرے اولیاء اور شعریاؤں کو کوئی دخل نہیں تھا میرے شاعر اور ادیب دوستوں میں کوئی بھی بیٹنے والا نہیں تھا۔ شریک و حام اور لوگ تھے کچھ اور صحبتیں بھی نازل ہو گئی تھیں۔ میں مومن کرنا لگا تھا عرش اور نظیر نے میں سے دوستی سے مجھے مکان دلا دیا ہے اس میں ہر فرد دوستی اور ادب سے دلی پسچی کو دخل نہیں لگے ان لوگوں سے بڑی چیز چڑھتی ہے جو اپنے آپ کو کھتے سے زیادہ دیر لکھیں۔ چنانچہ میں ان کی پیش میں معروضہ ہو گیا لیکن یہ سوا کچھ ہر گنا چڑا اور ان کی مصیبت میرے گھٹنے پر عرش لسیاں کا یہ شعر اس زمانے کی یادگار ہے:

تو کہاں آچہنا دل کو پال کھتی تھی ہو گئے یہاں رکھال

لڑھائے میں ہیں لوگوں سے سزا نے میں تعلق رہاں میں یہیم جس لطیفی کی غصہ ہے غافل کہیں کہیں بلکہ جو تیرہ روز کا لنگی۔ یہ صاحب مزے معافت کی تعلیم حاصل کر کے آئے تھے۔ بہت اچھے شاعر تھے اور علم کی گمان کے پاس نرا دلی تھی لیکن معافت کی ڈوگر کے ساتھ ساتھ وہ میرے پیچھے

بھی ساتھ لے کر آئے تھے کہ وہ ہمدردی موعود ہیں۔ وہ تنہا ان میں کے اصول پر ایک پندرہ روزہ پرچہ نکالتے تھے اس میں ان کی نظمیں بھی شائع ہوتی تھیں اور مضافات بھی۔ اس میں وہ اپنے ہمدردی ہونے کو ہر جگہ شہ کرتے تھے اور نظریہ ہمدردیت کے نام سے انھوں نے ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ یہ ہر مقام اشاعت کی جگہ دیکھنے والے کی بجائے ادبی زندگی گزارتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمدردیوں کے مضاف میں ہمدردی موعود ادبی زندگی کے گارڈ دیکھنا ہی اڑھائی ہے۔ کتاب کے سلسلے کے ہمدردی کو خود ہونے کا ثبوت خواہ نہ ملتا ہو لیکن ان کے کثیر لفظوں ہونے کا ثبوت ضرورتاً انھوں نے ادبی کی ہمدردیوں کا سہارا لے کر بڑے پتہ پر استدلال سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ ان کی ذات میں وہ تمام صفات ہیں جو ہمدردی موعود میں پائی جاتی چاہئیں۔ اپنے دلوں کی ہمدردیت کی تائید میں وہ اقوال کا یہ شعر بھی استعمال کیا کرتے تھے۔

ہر جس کی خودی پہلے نمودار

وہی ہمدردی وہی آغوش زامانی

اس سے گمان گزرتا تھا کہ ہمدردیت ان کے نزدیک وہی نہیں بلکہ کثرت چیز تھی اور ان کے دوسرے یہ صرف جنون تھا کہ کو دخل نہیں تھا۔ شاید انھوں نے اپنے طور پر ایک چال بھی کئی جو نا کام ہو گئی۔ اس سبب خواہ کچھ ہوں تیر میرزا گ تھا۔ ہمدردیت کا ہر چار میں ان کی دولت بھی ختم ہوئی تھی اور موت بھی۔ جب میں ان سے ملا تو وہ دھان دان رہ گئے تھے۔ سب سے پہلے کہ تعلیم کے بعد وہ پاکستان چلے گئے اس کے بعد وہ ہی جانتے تھے کہ ان کا کیا مشرورا۔

تخلیف کردہ اور ہی ان دنوں پاکستان میں یہ دو تصنیفی اور صحافتی سرگرمیوں میں مصروف تھے اور قریشی آنکھوں کی اذیت سے محال تھے میں رہنا کرتے تھے۔
 • صبح آئید بندہ جوئے کے بعد دیکر سچ پوچھو تو وہ چلا گیا کب تھا؟
 میں کچھ دن تک نہ جانے میں آیا وہ مگر وہی کرتا رہا اور پھر باہر کوٹھے کے چند روزہ قیام کے بعد لاہور کا رخ کیا۔

لاہور پہنچ کر ایک گونا گونا طبقہ میں ہوا کہ میرے ادیب اور شاعر دوست بھی آئندہ کی ناکامی پر رونا رونا نہیں ڈالیں گے تھے انھیں کچھ سے ہمدردی تھی اور وہ ایک مجلس میں کرتے تھے کہ مجھ میں ادبی کام کرنے کی صلاحیت ہے لیکن اس بات پر وہ بھی متفق تھے کہ ادیب اور شاعر کو روز بروز معاش بنانا پڑے گا۔
 ایک اچھا مصنفوں کے کہہ کر یا اچھا شاعر کہہ کر اور تو وصول کی جا سکتی تھی، معاوضہ نہیں۔ افسانہ دانوں اور نثر نگاروں کو تعلیم بیگ چھٹائی کے چمپے سے بھائی نصیم بیگ چھٹائی سب سے اچھے دوست تھے لیکن وہ دونوں خود گوشت و خونہ ماں کا فکرا تھے، انھیں خیر الہی کا معاملہ یہ تھا کہ

میرزا خود اپنے بھی کوئی کام نہ تھا

صرف حقیقت دانہ دہی کے تھے کہ تو قلم کی جا سکتی تھی انھوں نے کسی خیال سے بھی کام نہیں لیا کچھ معاش کا معاملہ ان دنوں تھا ہی نہیں اعلیٰ درجہ کو کام کرنے والوں کی تلاش تو رہتی تھی لیکن وہاں کام کا عنصر کچھ کر کے کیا جاسکتا تھا انھیں آپ جو چاہتے تھے کہ اپنے لیکن مانگوں پر کوئی ایسی خدمت داری مانتے نہیں

تھی کہ وہ تنخواہ داہگی کریں گے، انھیں سوچ سوچ کر حقیقت نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے پار سمنے والے تک نہ پہنچانے۔ پار سمنے کی ان دنوں بہت شہرت تھی اسے حلقہ خیار مندان لاہور کی جو حقیقت محمد جتوئی خیر پطرس اور بیگم ہری چند اختر پر مشتمل تھا انھیں معاشرت حاصل تھی اور اس کے ایک اور اثر یہ تھا کہ کچھ کے ساتھ حقیقت کے بہت اچھے مراسم تھے بلکہ ان پر حقیقت کے کچھ اسانات بھی تھے لہذا حقیقت کو بھی ان کے کہنے پر جو تنخواہ معاشرے کی جانب سے دی گئی وہ ادا بھی ہو گئی۔

حقیقت مجھے کتہ پار سمنے دفتر گئے کہ میرزا خیر الہی ناکام سے ملے حقیقت نے دو فرما کر بات کی اور بڑی مصفا سے کہہ دیا کہ تنخواہ چاہتے کم ہی مقرر کی جانے لیکن جو ملے پا جائے وہ باقاعدگی سے ادا ہوتی رہے کہ میرزا مجھے یہ بات ان لی اور مجھے تیس روپے ادا ہوا دینے کا وعدہ کیا لیکن دوسرے دن دفتر پہنچ کر جب مجھے یہ پتہ چلا کہ منشی دولت بخش جو پار سمنے کی کتابت کرتے تھے، ان کا تنخواہ کے مسئلے میں دفتر پر میں چار ہزار روپیہ واجب ہے، تو میرزا نے حوصلہ ہار دیا اور ہماری بار و خیر جانے کی بجائے ہمت نہیں ہوئی۔

میرزا حال پار سمنے کے بعد روزہ کو بھی میرے لیے مفید ضرور ثابت ہوئی۔ پار سمنے دفتر میں خیر الہیوں اور انھوں کا تاتا بندہ عادی تھا اور غالباً کاروباری طور پر اس کی ناکامی کا ایک سبب یہ بھی تھا اس روز بھی ان لوگ وہاں آئے۔ ان کی بات جیسے سے میرزا نے انکار نہ کیا کہ وہ میرزا کے روزگاری

ایسے کہ اگر جی کا میاں اگرچہ بہت ہے لیکن کاروبار کی طور پر وہ بہت کامیاب
 اور بخیر و بے انتہاء باقا زندگی سے ملتی ہے۔ پارٹنر کے عملی تعلق کے بعد میں نے
 انہی کا رخ کیا اور ان سے کسی میں طرز مت کو نہیں مل سکیں مگر وہ کہ دو دن میں
 یہ چیز فرو مل گیا کہ مختصر یہ معقول سڑنے کے ساتھ ایک اور روزنامہ
 "بھارت" آتا۔ نکلنے والا ہے۔ یہ اخبار پندرہ تا ایک چند ہی سٹرپران
 ساتھ ہوتا ہے وہ کہ شاد اور دلہور کے چند اور ہندو سبھاؤ حضرات نکال رہے
 تھے اور علامہ رام پشاد کو کسی زمانے میں ہندو سے انرم کے اڈیشن پر وہ چکے تھے
 اور علامہ اچیت داس کے دست بردارست تھے اس کے مدیر اعلیٰ انگریزوں کے تھے
 دوستوں کی فہرست پلٹھڑائی کو لیا کوئی شخص نظر نہیں آیا جو وہاں
 تک رسائی کا وسیلہ بنتا۔ آخر جرأت سے کام لیا اور سید جمالہ رام پشاد
 کے پاس پہنچ گیا۔ علامہ رام پشاد رجہ کارہ حقیقت سے خبر لائے ہیں۔ بیچ ہتھ
 کا پرچہ ساتھ لے گیا تھا اس کی دقت گردائی کرتے سہے جس کے دوران میں
 ان کے پیروں پر کچھ پسندیدگی کے آثار بھی نظر آئے۔ آزارش کا مطلب
 آیا جب انہوں نے کہتے ہیں جو چاہا کہ روزنامہ صحافت کا مجھے کہاں تک تجربہ
 ہے اور تجربہ کی صلاحیت کون سی تھی ہے؟

مجھے روزنامہ صحافت اور تجربہ کا کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن اس مرحلے
 پر میری ماضیاتی کام آگئی۔ میں نے کہا کہ انہی مجھے تجربہ تو ہے اور آپ
 چاہیں تو اس قسم کے سرٹیکٹ بھی بھیج کر سکتا ہوں لیکن یہ سرٹیکٹ مجھے بھی
 نہ کہتے ہیں کہ ان آپ میرا تجربہ ہی امتحان لے کر میری صلاحیتوں کا خود ہی

فیصلہ کر لیں۔ یہ بات انہیں برا لگتی۔ انہوں نے مجھے کچھ خبریں دیں جن کا میں نے
 ترجمہ کر کے چھپکر مضمون رواں اس کا بھی میں نے ترجمہ کر دیا کام انہوں نے سنا گیا۔
 انہوں نے صرف دو باتیں مجھے بتائیں ایک یہ کہ مضمون کا ترجمہ کرنے وقت ملاحظہ فرمنا
 کہ کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ میں ایک خبر میں اسے نظر انداز کر گیا تھا۔ اور
 دوسرے یہ کہ زبان جہاں تک ممکن ہو انتہائی سادہ استعمال کرنی چاہیے۔

"مجھے سید صاحب نے کہہ دیا کہ اگر کمالی کرتے وقت انہوں نے میری غلطی
 دیکھ لی تھی کہنے لگے کہ انہم سب اسی موضوعات پر کچھ اعلیٰ کر سکتے ہیں میں نے
 ہاں کہہ کر انہوں نے لیکن انہوں نے کہنے پر کچھ بھیجا تھا ہے۔ میں نے کہا کہ ایک شاعری
 میری محبوب نہیں ہے یہی ہے جس کے کہیں انکا نہیں کرتی اس پر بے غماش نہیں رہے
 اور کہنے لگے کہ آپ خبری سوال یہ ہے کہ تم اخبار کتنی لوگ؟

اب تک کی بات چیت کے تجربہ میں کالی جرأت پیدا کر دی تھی میں نے کہا
 اور کچھ جب میں اس کے سر میں داخل ہوا تھا تو میرا رادہ میں روپے طلب کرنے
 کا تھا لیکن اب میں امتحان میں کامیاب ہو گیا ہوں تو مجھے چاہیے روپے لئے
 چاہئیں۔ انہوں نے فوراً ہی مجھے خبر کے نام چٹ نمے دی چٹ پر چاہیے
 کی بجائے پینتالیس روپے خواہ وہ سچ تھی۔

"بھارت" آتا ہے جائنٹ ایڈیٹر مشروہی و بال ہائیڈ تھے جنہوں نے ناچہ
 میں ان کی صفت روزہ چیتا جاری کیا اور اسٹنٹ ایڈیٹر میں میرے
 علاوہ ایک نام مشروہی، جہاں اس اختراک چیتا کے موجودہ جائنٹ
 ایڈیٹر غالب داسے۔

ایک طرح و رسم وہ مثال تھے۔

شرعاً ہی اسے آنکھ پیرا ہو گئے تھے نہ سہارت، نہ چاہئے کہ انہیں۔

اگر کوئی بات اس کے خلاف چلائی تھی تو سہارت لانا ہندو سہائی نقطہ نظر کا
کارتزجان تھا اور رنگ پہننا ورنہ کاغذ اس چھائی تھی پھر اس کا سہارا
بھی کوئی طور پر اس صلاحیت سے محروم تھا جو ایک نئے اخبار کو چلنے پھرنے
اعبادوں کے مقابلے میں کامیاب کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ حالانکہ اس پر
شریف اور ذی کمال آدمی تھے۔ انھوں نے وفائت ایک ایسے دور میں شریعت کی کئی
جہ اس کا مقصد تبلیغ ان معارف و نظریات کی پورے شرف تھا اخبار کو نفع بخش و بڑی
جزیرہ کنال کے لیے مگر نہیں تھا صفات کے لیے ان میں ایک اور تیری سے بھی
وہ بے خبر تھے۔ ان کے ذہن میں ایک ایسا تجربہ نہ تھا کہ بہت بہت نیچے تھے لیکن
اسلام میں خبروں کو اس لیے پوزیت حاصل ہو گئی تھی جو خول میں ملنے پر
لکھتے اور کئی بار تو یہ قرا ل بھی اس کے لیے وہ مطالعہ کی کرتے اور استدلال
کی بھی پوری سہارت نکالی کر لیتے مگر پھر وہ ان کی خبریں دریا میں غرق نہ ہوندا اور
پڑھنے والوں کا ذہن دیا یہ چکا تھا کہ کچھ سارے کے بغیر کا نہیں چلا تھا۔

سرکاری دیوال بھائی کو اپنی صلاحیتوں کا سہارا سمیٹا ساس تھا۔ وہ
کہتے تھے کہ انہیں پارکٹ ایئر میں قرار دے گا ان کی حق شناسی کی گئی ہے چنانچہ
انچھ سو سبھوں سے اخبار کو کوئی فائدہ پہنچانے کی بجائے وہ ہمارے سامنے خاک کا
کئی ہیں لگے رہے تھے۔ ایک عام اور بے حق کو کام کرتے ہیں بے کھمبہیں دیکھا
کئی بار بات کی ڈیوٹی پر ہیں ایک عام اور جیسا اس حاضر ہو تے تھے۔ بالکل کم

و فریجنگ کر کو ہی پر چیلنے اور پانچا دس منٹ کے بعد سوجھاتے ہیں اور
مناہدہ شریعت میں فوری کا وقت نہ ہوئے کے بعد ہی چلے گئے۔

ایک تو میں دیکھنے کی آنکھ کی وجہ سے بزم خیر میں مبتلا تھا اور
دوسرے طاقتور بلے بڑی مشکل سے لی تھی اس لیے میں نے بڑی محنت سے
کام کیا اور جتنا اس اختیار کو مستحق ہونے کے لیے مشہور ہیں۔ چنانچہ ایک عام
ہی کا نام ذکر نہیں کھنک نہیں تھا۔ دھرم وریک جہاں دین ویاں بھائی
کے ساتھ تھیں اور دین ویاں بھی ہر شکل میں ان کے آئے آجاتے تھے۔
جنوں کے شے کے انچھ سو ہو گئے دین ویاں ہی تھے اس لیے دھرم وریاں بھنے
کو اول باب لڑا ہے کہ اس صفت پر عمل کرنے لگے تھے۔ اس سلسلے میں ایک بدین
تھا ایک ایسی کو تا ہی سرزد ہوئی جس کے باعث اخبار قبل از وقت ہی مر گیا ان
دو دن وہ رات کی ڈیوٹی پر تھے۔ اخبار کی پہلی صفحہ اس طرح قائم کی جاتی
تھی کہ کسی بڑے یڈ کے بیان کا اہم حصہ وہیں میں دیکھا گئے یہ ٹھہرا جاتا کہ
تھیں یڈ کا لانا نہ بیان۔ اس رات گاندھی جی کے بیان کو لایا گیا جانا تھا پھر
سے ان کی تحریر پر ہی لکھی تو اس نے پوچھا یہ کیا لکھا ہے؟ دھرم وری نے فرنگ
یہ کہہ دیا: "اے ٹھہرے جانا گاندھی جی کا وہ بھی اس: "جنگل حاکمیت کا تب
لے ہیں کہ وہاں یہ ساری اسی طرح چھپ گئی۔ بعد میں اخبار کے پہلے صفحے پر کئی
دن تک معافی نامہ چھپتا رہا لیکن لوگ بھی سمجھتے رہے کہ ہندو سہائی اخبار
ہے اس لیے اس نے گاندھی جی کی توہین مزا بھی کی ہو گی۔

انہاں کی کامیابی کے امکانات پہلے بھی کچھ زیادہ واضح نہیں تھے لیکن اس

حاصل نے تو اس کی کمری توڑ دی۔

امام پر شاد میرے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے رہے اور میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ ان میں بزرگ گاندوگر کا بھائی بہت تھا اور وہ اپنے ماتحتوں کی کوتاہیاں ہمیں کڑاں دیتے تھے۔ ایک بار انھوں نے سائیکل کی نقل کے عنوان سے ایک سلسلہ مضامین لکھا۔ ہم بھی لوگ دفتر میں اس کا خلق کرتے رہے اور مذاق بھی مذاق میں آئے یہ شعر اس چچا کا کہنا:

تیرے پیسے کا وہ کیا کہنا

حاصلی سائیکل بات ہے پیارے

وہی دیال جھانپنے نے زیادتی یہ کہ کٹیلی خون پر شعر عبدالحمید صاحب

کو شادیا اور انھوں نے اسے "افکار و محاورات" کا جز بنایا۔

لازمی تک بات سچی تو انھوں نے مجھ سے پوچھا میں نے صاف انھوں کو کیا کہ یہ شعور انھیں میں نے کہا تھا لیکن اسے دفتر سے باہر پھیلانے کے معاملے میں میرے قصور ہوں۔ لاہوری کو نہیں تھا کہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ انھوں نے بات کو ہمیں کڑاں دیا لیکن ان کی بزرگداشت و شفقت کا کچھ احساس مجھے اس وقت ہوا جب "بھارت" نامی ہندو ایک دن پہلے مجھ سے کہنے لگے تم یہوں "مطلب" کے دفتر چلے جاؤ۔ میں وہاں گیا تو مجھ سے صرف ایک سوال پوچھا گیا: "کتنی تنخواہ لوگ؟" میں نے فرمایا اس روپے کہا لیکن مجھے ملے پچاس۔ تھا ہر پے

حدیث انقلاب کا ترجمہ ۷۴

کہ یہ بھی لاہور میں پر شاد تھا کہ کام تھا۔

"مطلب" میں پہلا قیام بہت مختصر رہا لیکن اس مختصر سے وہ نے بھی بہت اور بصیرت کا بہت سا سامان میرے لیے فراہم کر دیا۔

ان دنوں اردو اخباروں میں مروجہ سائز سے نصف سائز پر چھپا کرتے تھے۔ "مطلب" کا ایک سطر ایڈیٹر نیل کے پے دفت تھا جسے لاہور شمال چند یا دہری جگہ تھے۔ دوسرے سطر مختصر ادارتی نوٹ اور کلامی کالم چلتا تھا۔ یہ سطر میں لکھتا تھا: "ہمیں کی خانہ جنگی شروع ہوئی تھی۔ جس تقریباً ہر روز مختصر آتی تھی۔ یہ ساری حکومت کی حمایت اور پٹیلی باغیوں کی مخالفت کرتا رہا اور کبھی کسی نے نہیں لڑا لیکن ایک دن یکایک کیا دکھتا ہوں کہ ایڈیٹر نیل کے سطر پر ایک پورا ایڈیٹر نیل باغیوں کی حمایت اور یہ ساری حکومت کی مخالفت میں موجود ہے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے ہجرت کا اظہار کیا تو انھوں نے بات کو ہمیں کر مائل دیا: "اخباروں میں سب جتا ہے۔"

"نہیں ہوں مگر چھوڑ کر جو انگریزی میں لکھتا تھا پنجاب کے اخبار ان دنوں پائیس نام کی کسی چیز سے آفتاب نہیں تھے۔ مصافحی کالموں میں ایڈیٹروں کا رویہ یہی ہوتا تھا جو ایک جگہ ہوتے جاگے دار کا اپنی جاگہ میں ہوتا ہے۔ جو مصافی جتنا شہر تھا اتنی ہی میں مانی کرتا تھا۔ اس کی نمایاں مثال "نہیں ہوں" کے ایڈیٹر مولانا ظفر علی خان تھے۔ پہلے اپنے بیان کی نظر چھ کر کہ تو چل جاتا تھا کہ آج ان کا مولود پیدا ہوا ہے اور دوسرے گوش یا غرضی ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہاں سے شخصیتیں

ہوں اور اگر کسی ملک سے ملے میں ہاں کے خلاف جتنی باتیں بھی چاہیں تھیں وہ
سب زمیندار کے ادارتی صفحات میں تلاش کی جا سکتی تھیں۔ باقی اخباروں کا
حال بھی کچھ مختلف نہیں تھا فرق صرف اتنا تھا کہ ان کے ایڈیٹروں کو قلعہ علی گڑھ
کا زور قلم بستر نہیں تھا۔

ستم ہائے ستم بد تھا کہنے والے اپنی تحریروں کا کوئی احترام
نہیں کرتے تھے اور انہی کے اصولی پر ناز نہ تھے۔ پڑھنے والے ان کی تحریروں
میں ششوں پر کر سچسور لنگ پڑا اور وہ جوتھے لنگی خود ان لوگوں کے باہر کرم
پاس بکھڑی کھڑے پڑتا اور وہ صحافتی باروری کی اخوت کے نام پر آپس میں
شیرو شکر بنے رہتے۔

کچھ وقت روزنامہ اخباروں میں مذکور مخالفت کا پورا چرچہ ہی قابل فخر
اعتبار میں کیا جاتا تھا۔ ہم سے ایک کانام گرو گشتالی تھا ایک شیطان
تیسرے آتش نامہ تھے یا دہشیں رہا غائب۔ دھول تھا جب ان کو دیکھ دہش
عدت سے پہلے دہش تو حکومت نے دہشیں شروع کر دیں تھیں سے ایک ہندو تھا
اور ایک مسلمان جس میں ہندو یا انسانی سے وہ دونوں ایک ہی جیل میں تھے۔
رہا جو کہ ان میں سے ایک نے جسے مطروق سے کہا کہ حکومت نے ہمیں مذہبی منافق
پیدا کرنے کے الزام میں سزا دی تھی لیکن ہم مصلحت طلب ہیں چاہیں ان کی ناکا ہے جسے بہت
فکریں ہے کہ اسے ہاتھ نہ دیا جائے تھے انہیں اس کی دادرسی دی جا سکتی ہے۔
شعوت کی انتہا تھی۔

غلاب میں کام کرتے تھے چار جیسے بکا ہوئے تھے کہ ایک دن وہ فریضے

بکھیرا جس کے ذریعے پچھلے تحریروں میں سونے تھا کہ مجھے بھارت کیا جا رہا ہے
میں چھپ کرے پاس بکھیرا اپنی باتیں اندہ خواہ وصول کر لوں۔ بھارتی کے اسباب پر کئی
روشنی نہیں مل سکتی تھی۔ میں جوتھے کے کو شجر کے پاس گیا تو سمنے مجھے مشورہ
دیا کہ میں روزہ خصال چند سے مل لیا لیکن میرا بھی نہیں پتا اور میں خواہ وصول
کر کے چلا آیا۔

بھارتی کے پچھلے اسباب کا علم مجھے کبھی نہیں ہوا میرے کام پر نہ اند
خداوت میں کوئی خاص حرف نہ تھا جس کی گئی تھی صرف ایک متبادل دینی نظریے پر
پر دلف سہ لنگ کی ایک لفظوں لنگی تھا جس کا ذمہ دار مجھے اور میرے یکساں تھا
میں رام کو شجر پر اپنی غائب مجھے اور انہیں الگ الگ خدائے تھے جہاں میں تھا تھا
کہ اس لفظ کی یاد میں نہیں دس دس روپے جوتھے کی سزا دی جا رہی ہے۔
میں رام کی وہ خط لکھ کر میری کے پاس پہلے گئے اور وہ دس روپے کا نوٹ
نے کر رہا تھا کہ کرنے کے لیے خیر انجی کے پاس بھیج کر خطوں میں بھیجا بیت کی گئی
تھی کہ جہز جہز ان کے پاس بھیج کر وہی خیر انجی نے نہ چراند وصول نہیں کیا
اور مجھے رسی کے پاس جانے کا مشورہ دیا میرے کہنے پر کہ انہوں نے اپنے
خدا میں جو آپ نہیں ہیں کی بلکہ سزا دی ہے جس کی صرف تحصیل ہی باقی ہے اس نے
کہا کہ جہز اندہ خواہ میرے کاٹ دیا جائے گا لیکن جہز کا نام بھی نہیں کیا۔ ہمار
میرے انہیں جہز اندہ کائنات کے لیے کہا اور انہوں نے لگے اور پھیل دیا یا آخر کی
حساب کے وقت بھیجے کہ تم کوئی نہیں لگتی۔

ایک اور بات بھی تھی جس کا بھارتی میں جو اسطہ طور پر دخل ہو سکتا تھا

دوں بھائیوں پر اندر و جرم نے کاغذ میں تحریر کیا تھا۔ لیکن دانی اور کیوں کے
 کیرکڑ پر چل گیا تھا اس کے نتیجے میں چند دوستانہ بھروسوں کے خلاف اجتماع
 ہوا۔ اس پر اگرچہ ماحولی وقت کے مطابق کاغذ میں تحریر کی ضرورت نہ تھی
 حمایت ہی کرتا تھا لیکن اس کے بلکہ دانی اور کیوں کے ہاں چند وجوہات تھیں
 تھیں اور یہاں پر مائند کے ساتھ تو ان کو مخالفین کے ذاتی مراسم بھی تھے۔ اس لیے
 اس پر ان کے دفتر میں بات چیت کے دوران میں یہاں پر اس قدر کوئی بجانب نہیں
 جاتا تھا۔ ایک روز رات کے وقت عید و خوشیوں چند بھی داری کی کہے
 میں موجود تھے۔ اس مسئلہ پر بحث ہوئی اور چند سب ایڈیٹروں نے قلمب
 داری کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کاغذ میں تحریر میں حصہ لینے والی
 لڑائیوں کے خلاف کافی سخت افکار استوار کیے۔ انھوں نے فیضان ہو سکا اور
 میں نے جو اہم بھائی پر مائند کے خلاف کچھ ایسی باتیں کہیں جو حقیقتاً لازماً
 تھیں۔ لیکن کسی نے کہا تو کچھ نہیں لیکن اس واقعہ اور میری بھارتی کے درمیان
 وقت کچھ زیادہ نہیں تھا۔

اس باب سے نکل کر دانی اور کیوں کا سامنا تھا لیکن اتفاق سے میری
 ملاقات ایک بھروسہ دار دام پرشاد مالک میسرورم وقت دل ایڈیٹر سے ہوئی۔
 ان سے ملے پتا کہ اگر میں ان کے کہنے کے لیے گیا تو وہ دیکھ کر براہ کچھ نہ
 کچھ دینے دینگے۔ میں نے تین چار دن کے عرصے میں ان کے لیے کئی کئی بچے کہ
 دیے۔ ایک کتابچہ جو شرم پر تھا و تین مین کارڈ مارکس اور اسٹیشنری کی
 سواری عمر پر تھیں۔ ان چاروں کتابچوں کے داخلی مقوی افلاحت کے

موضوعات میں دانی اور کیوں کے زیادہ نہیں تھا لیکن ان کی کم بھی نہیں تھی کہ طلب کی عادت
 چھیننے کی تعالیٰ ذکر کرے۔

کئی برسوں کو کافی خبریت حاصل ہوئی اور ان کے کچھ بعد دیگرے کئی
 ایڈیٹر شائع ہونے کے ایک وقت تو عالم پر مائند فوجوان کیوینسٹ پارٹی سے
 رابطہ کرنے کی کوشش کرتے تو اس سوال پر کہ انھوں نے اس وقت
 تک اس مسئلے میں کواپڑا کیا ہے۔ وہ انھوں نے کتابچوں کے نام ہی لیا کرتے
 تھے۔

کیونست حضرات اب ان کتابچوں کے حوالے سے کچھ پر عمل کر رہے
 تھے۔ ان کے ہاں وہ کچھ بھی تھے کہ میرے خیالات میں کافی تبدیلیاں
 آئی ہیں لیکن وہ تو یہ ہے کہ جہاں تک راسخ عقیدہ کیونستوں کا تعلق ہے
 وہ ان کتابچوں کے خلاف ہی تھے۔ سو غلام میں میں نے جس چیز کی حمایت
 کی تھی وہ کیونست نہیں بلکہ جمہوری سو غلام تھا کہ اب کو کتنے وقت زیادہ
 استفادہ میں نے انگلستان کے لیبرن مفصلوں سے کیا تھا اور تو یہ سو غلام
 کے لیے جاری تھا کہ اب کو کتنے برس میں مائند پر مائند کیوینسٹ نقطہ نگاہ
 کے متغیرات تھیں۔ جہاں تک ان کیوں اور کئیوں کا تعلق ہے جو سو غلام
 کی تحریک کے پیچھے کارل مارکس کی پیدائش سے پہلے ہی کارفرما تھیں۔ اس کا
 مخالف ہونا بھی نہیں ہوتا۔

اس میں کی سواری عمری کیوینسٹوں کو عرض یہ تھا کہ اس میں اس میں
 کے مقابلے میں اس کی کوڑا چاہا گیا ہے۔ دراصل یہ بھی کتاب میں ہے

باقی معلومات کی بنا پر وہ کسی خاص فرد و ذکر کے بغیر لکھی تھیں۔ ان میں سے ایک کا انتخاب ان لوگوں کے نام سے کیا جودنیائیاکی خواہشات کے سائے میں ڈالے جاتے ہیں۔ خاصا یہ ہے کہ اس قسم کا روحانی نفاذ یہ فکر کسی بھی آدمی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ ایک میں ہی کبریاں وہوں اختیار کئے والے ہر اس شخص کو مہیا پریشاں مان لیتے تھے جو کوئی بڑا کام کر گزرے:

چرا از دست تو کار و تادر آید

گناہے ہم اگر باشد تو اب است (اقبال)

لوگ بڑے کر شخص، بنگ اور کاروں اور اس کا نام ایک ہی سانس میں دیکھتے تھے اور انہیں مطلق احساس نہیں ہوتا تھا کہ کاروں اور اس کی شخصیت اور باقی شخصیتوں میں بنیادی تضاد ہے۔

انہی دونوں میں نے انسان کی انسانیت کے عنوان سے بھی ایک مجموعہ ترتیب دیا تھا جس میں مختلف نقلاویوں کی حیات مندی اور جاننازی کی داستانیں درج تھیں۔ یہ کتاب میں نے خود ہی شائع کی تھی اور ظاہر ہے کہ مجھے کتب فردوسی کا کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن خوش قسمتی سے کچھ اسکولوں کے ماسٹر سیرے کرم فرماتے اور وہ دونوں نام رواج تھا کہ انگریزی کے بے ایک سے نامہ جلدیں ہیں کی تعداد بڑی اوقات چالیس پچاس تک بھی پہنچ جاتی تھی۔ فردوسی کی تصانیف اس طرح کتاب کے قابل اعتراض و مضمون کے باوجود کوئی ڈیڑھ سو کے قریب جلدیں اسکولوں کی کتب خانوں میں چلی گئیں۔ انی مادی مشہور و مشہور، پید مبارک ساغر نے یکشت خرید لیں۔ اس طرح انہی

ناخبرہ کاری کے باوجود مجھے کافی رقم مل گئی۔

اور اہل حقوق کے ساتھ بھی بڑا مصلحتی برادر ہوا تھا۔ احسان دانش نے میرزا قارف مولانا آقا جیسے شخصیں بعد میں شمس اعلیٰ کا خطاب ملا کر لیا۔ فائزہ خیر بی بی جتنی حالات میں مولانا نے مجھے شورو و بگو میں ان کے ادبی حریف سے خطاب کی اور اس سے خیال ہوا۔ یہ چنی کش میرے لیے نعمت ہے کہ انہیں مل گئی اور میرے لئے شکریہ گزاری کے ساتھ قبول کر دیا۔

مشاہدہ میں میری نظر صرف تیس روپے کی تھیں: فرزند میرے بیٹے باقاعدہ حامی فروری نہیں مل گئی میری دست داری صرف اتنی تھی کہ میرا رب کر کے اسے بروقت شائع کر دوں۔ مشاہدہ کے بیشتر مضمون نگار ایسے تھے جن کی تحریر دل پر نظر پانی کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ خانہ بڑی کے بچے ہر وقت ابو محمد امام الدین دام نگری کے مضمون موجود رہتے تھے جہاں نہ آنے کی صفحہ کے حساب سے چھپتے تھے ابو محمد امام الدین کے علاوہ آسمان نگری کے مضمون بھی انہی غزل نگار پر چھپتے تھے۔ ان دونوں حضرات کے صحیح ہونے بیشتر مضامین مندی حرام سے ترجمہ شدہ ہوتے تھے۔ ان کی طرف سے یہاں جاتا بھی گئی کہ یہ مضامین کسی بھی نام سے شائع کیے جاسکتے ہیں مگر کسی ماہ مضامین کی قلت ہوتی تو ان حضرات کے متعدد مضامین مختلف ناموں سے شائع کر دیا جاتے جن ناموں سے مضامین چھپتے وہ زیادہ تر فرضی ہوتے۔ لیکن کئی بار یہ بھی ہو گا کہ مولانا آقا جیسے کسی کو نواز یا جا یا تو مضمون نہ اس کے نام پر شائع کر دیا۔

ادارہ کی طرف مختصر راستہ کے عنوان سے مولانا خود لکھ کر گئے تھے مسکین بچے
 ہا بیت بھی کر گھر بروقت پہنچے نہ ملیں تو میں خود ہی لکھ دیا کروں۔

بچے لازم رکھتے وقت مولانا نے یہ وعدہ بھی فرمایا تھا کہ خواہ کے
 علاوہ مجھے مبالغہ میں بھی ۲۵ فی صدی کا شریک سمجھا جائے گا لیکن جتنے دن میں
 وہاں رہا مولانا کے بیان کے مطابق رہے میں خسارہ ہی ہوتا رہا جہاں تک میل
 خفین ہے میرے نہ تو ان کے وعدے پر بھی غیب دہی سے سبھر دہی کیا اور نہ
 کبھی انھیں اس کی یاد دہانی کرائی۔

تھوڑا ہی کی کے مسے کا محل بھی علیحدہ ہی آیا شاہکار کے دفتر کے
 نزدیک ہی ایک مکان بی ملکیت کاشمی کا سا سن برڈ نظر آیا یہ ایک ہفت روزہ
 فلمی جریدہ تھا جسے کرن دیوان چم گئے جن پر فلمی میسر وہے اور اب چھپنے لگے
 رول آؤ گرتے تھیا نکال ہے تھے کرن دیوان سے ملاقات ہوئی تو بڑے جہاں انھیں
 کسی ایسے آدمی کی ضرورت ہے کہ ان کے اخبار کے لیے ایڈیٹر بنیں وہ میرا لکھ دینا
 کرے میں نے جس پر وہ پہلے ایماء دیا یہ وہ ضرورت ہی قبول کر لی۔

۱۰ بہت لکھنی آتا تھا وہ نہیں نکلا تھا اور کرن دیوان اکثر ان کی مشکلات
 میں مبتلا رہتے تھے مجھے خواہ مخواہ بھی باقاعدگی سے جنس ملتی تھی اور واسطاً میں نہیں
 روپے ماہواری پر ملتے تھے لیکن دفتر پر کرن دیوان خوب سچا کر رکھتے تھے میں
 اپنا زیادہ وقت وہیں گزارتا تھا اور شاہکار کا کام بھی وہیں ہی لے کر کرتا تھا
 ملنے والوں کا بھی جو مختصر شاہکار سے سلسلے میں آتے تھے وہیں لکھتا رہتا

(مولانا غور کا سلوک میرے ساتھ بہت مشفقانہ تھا انھوں نے

قارئین شاہکار سے میرا تعارف بہت لچھے لفظوں میں کر دیا اور میری شرا و میری
 شاعری کی دل کھول کر تعریف کی صرف یہی نہیں بلکہ ایک مرتبہ انھوں نے
 میرے ایک شعر:

مجھے زندگی کی دعا دینے والے

ہنسی آ رہی ہے تری سادگی پر

پراچھا خاصا مسخروں لکھ دیا میرا شعر بن جان دو خاص و عام ہے اور سیر ان خیال
 ہے کہ اس کی مقبولیت میں مولانا کی غرض کو ظاہر ملے۔

ادارہ کی معاملات میں بھی انھوں نے مجھے خودی آزادی دے رکھی تھی میرا
 نام پر چھپ رہا مولانا کی حیثیت سے بہت سی ایسی ہیمن مسخروں لکھ دیا کہ وہیں کوئی خط
 میں اپنے ہی نام سے لکھتا تھا اور مضامین دیا قبول کرنے کا بھی مجھے پورا
 اختیار تھا اس سلسلے میں ایک دو بار مولانا نے بڑی کشادہ دلی کا مظاہرہ کیا۔
 ابوہریرہ ام سلمہؓ کی مہینہ بھر کی مہینہ بھر میں انھوں نے اپنے ایک مضمون میں انہوں نے لکھنے والے
 ہندوؤں کی اس وحش پر اعتراض کیا تھا کہ وہ اپنی تحریروں میں ہندیوں کو مسک
 کے لفظوں کا بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں اور اسے انھوں نے اردو لکھ دینا
 تحریب کا نام دیا تھا میرے اپنی طرف سے اس کے نیچے ایک نوٹ لکھ دیا
 کہ اگر مسلمانوں کو اردو میں ملنے اور فارسی کے الفاظ استعمال کرنے کا حق ہے
 تو ہندوؤں کو مسکرت کے الفاظ استعمال کرنے کا حق کیوں نہیں؟ مسلمان اپنی
 تحریروں میں کیا نہ استعمال کر سکتے ہیں اور ہندو مسکرت کے لفظ کو جہاں سے
 نزدیک آؤ وہ ایک ایسی زبان ہے جس میں بدلتے اور مولوی دونوں کی زبان

خیال کر سکیں۔ بلوٹ شائع ہوا تو ابو عمر امام الدین صاحب نے مولانا کو کئی احتیاجی خط لکھ کر بھیج دیے مولانا نے انھیں اپنی جواب دیا کہ اے میرے گویاں مشکل ہے، میں نہیں باپ کو جو کچھ کہتا ہے اسی کو لکھتے۔

مولانا کو ان کی غلطی اور غلط فہمی کا کھلم کھلا کر لکھا تھا جناب میں اردو کے فراموش میں کا حضرت مسیح علیہ السلام کی خدمت میں جان دے دینا مناسب ہے زیادہ ہے ان کے دوستوں اور پیارے بندوں میں مسلمانوں سے کچھ زیادہ مند اور سکھتے اور بولنے والوں سے کچھ زیادہ بولنے والے ایک بار اپنے ایک نوٹ میں خود کے بھائی ابراہیم کے متعلق انھوں نے کچھ تحریر کیا تھا کہ وہی نوٹ مجھے ملو میں نے احتجاج کیا کہ میں یہ ہے کہ میرے حوالہ بھائی جو اس پر ہے میں یہ تحریر شائع نہیں ہونی چاہیے مولانا کا فوراً جواب دیا کہ آپ یہ بے کے ایڈیٹر ہیں اور میں جب کا قصور نگار آپ کو میری تحریر ستر و کر کے کا بھی منتخب ہے اور اس میں تو کیم کا بھی۔

دفعہ دوم کے سلسلے میں مولانا کے کچھ زیادہ منا نہیں ہوتا تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ان کے غصے کی محبت سے محروم رہا جب بھی کوئی اہم آگاہ ان سے ملتا تو وہ مجھے بلا جھجکتے تھے اور خوب کتاب کے حوالے بھی کرتے تھے لے جاتا تھا اگر میں یہ اعتراض نہ کرتا تو نہایت جری تاخیر کر رہی ہوتی کہ میرے اہل ذات کی نشوونما میں ان محبتوں کو دل دھن ہے۔

مولانا دھسترنے کے آدمی تھے اور تھا یہ کہ میرا آدمی دوستوں کے ساتھ دشمنی جانتا تھا اور دشمن دوستوں سے زیادہ با اصول اور سرگرم

ہوتے تھے۔ ان کے سب سے بڑے حریف حفیظ جالندھری تھے اور وہ لوگوں میں ہمیشہ چچاٹش رہا۔ وہ پورے تقریباً سبھی ادیب اور سائنس دانوں کے کسی ایک کے دوست اور دو محرم کے دشمن تھے۔ میں ان حدود سے چند لوگوں میں تھا کہ ان دونوں کے ساتھ دوستانہ مراسم رہے۔ یاد رہتا ہے کہ جب میں نے شاہکار کی عظمت اختیار کی تو اس کے بعد پہلی ہی ملاقات میں حفیظ نے پوچھا کہ تم وہاں پہلے کیسے رہا کرتے ہو گے؟ جواب میں میں نے کہا تھا کہ کچھ عرصے کے بعد سے سائنسے تاجور کی بڑائی کی ہے؟ میرے اس جواب نے انھیں ملنسار کر دیا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ میں نے یہ اصول بنائے رکھا کہ میں اپنی چچاٹش سے الگ رہ کر وہ لوگوں کی کے ساتھ اپنے نیاز و مناد تعلقات قائم رکھوں۔

مولانا تاجور نے اپنی زندگی میں کئی ادبی کارنامے انجام دیے۔ انھوں نے ادبی اور کئی طرح ڈاکیومنٹس کے پیش نظر دو ادب کے فروغ اور اشاعت کا ایک بہت بڑا کام کیا اور اس کے لیے اردو کے نامور ترین ادیبوں اور شاعروں کا تعاون حاصل کرنے کی میں وہ کامیاب نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے سوائے کا نظام بھی کر دیا۔ ادبی اور محاورہ شایع کیا۔ جو بھائے خود تاریخی اقدام تھے لیکن جیسا کہ میں خود اعتراف کرتا، اپنے دیگر لوگوں کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے میں وہ خاطر خواہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ان میں اتھارٹی اور کاروباری سوجھ بوجھ کچھ زیادہ نہیں تھی۔ وہ اپنے رفیقوں اور کارکنوں سے بھی اتھارٹی رکھتے تھے لیکن میرے خیال میں اس بات کے اثرات سے ان کے کارکن کے اسی پہلو سے ملنے تھے جو ان کے ضرورت سے زیادہ انہیں بہت

تھے جب کامیابی کے امکانات سے سرشار ہوئے تو اس سرشاری میں اپنے کارکنوں کو بھی شریک کر لیتے تھے جو کہ توقعات سے ہمیشہ کم نکلتا تھا اس لیے کارکنوں کو ملنا کے ضمنی سواک کے باوجود شکستِ ظہیم کے بعد دل برداشتہ ہو جاتے تھے اور بے دلی ان کی صلاحیت کار کو سلب کر لیتی تھی۔ غالباً میمن کا نائبہ اسی لیے ہو گیا کہ اس کی اس خا عرا و افتاد طبع کو کوٹھڑکھ کر حالتِ موجود پر ہی قناعت کیے۔ رہا تھا اور قبل کی غرض رائے توقعات کی سرشاری کو اپنے دل و دماغ پر مسلط نہیں ہونے دیتا تھا۔

مجموعی طور پر یہ لانا کا یہ بیان صحیح ہے کہ جی لوگوں نے ان کی طاقت کی وہ حد کی طاقت چھوڑنے کے بعد بدوش و روزگار کا شکار ہو رہے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ دشکاران لوگوں میں نہیں رہیں کیونکہ ان سے لوگ رنگہ ترس ہو جاتا۔ طاقت کا خالق ختم ہونے کے بعد بھی دھجے اپنے نیاز مندوں کے زمرے میں شمار کرتے رہے اور میرے دل میں بھی تھا کہ ان کے لیے ویسا ہی احترام موجود ہے۔

کرن دیوان کے ساتھ بھی میرا زیادہ اچھا بھلا نہیں ان کی مافی خلکات سے ان کا وہ حال ہے جس اور وہ مجھے اپنی تحوا نہیں دے سکتے تھے میں کوئی انجمن نہیں کرنا تھا۔ جگت کشنی شہد اسنگی کا سب سے بڑا ناوند مجھے یہ تھا کہ ایک آراستہ کمرہ اٹھنے بیٹھنے کے لیے میسر آگیا۔ سینا کے ۵۵۵ بجے مل جاتے تھے خود بھی دیکھتا اور کئی بار اپنے نائب دوستوں کو بھی ساتھ لے جاتا اور اپنی مصغرات پر کچھ بار بار داری حاصل کرتی۔ دوستوں کے میں اور دشمنوں کے خلاف جو چاہتا تھا وہ یہاں صرف ملکی معاملات میں دیکھے کرن دیوان کی مصغراتوں

کے ساتھ دیتا ہوتا تھا۔

پنجاب کا گھر میں ان دنوں دو دھڑے تھے۔ ایک ڈاکٹر کوئی چند ایک ڈاکٹر سترہ سال کا ڈاکٹر سترہ سال کے دھڑے کے کچھ حضرات بالخصوص ڈاکٹر کیرانہ سہیل جرسیدہ جو چشم برونڈ کے نام سے مشہور تھے میرے دوست تھے چنانچہ میں جگت کشنی میں ڈاکٹر سترہ سال کے میں اور ڈاکٹر کوئی چند کے خلاف اکثر کھڑا کرتا تھا۔ ایک بار کیرانہ سہیل کے ساتھ ڈاکٹر سترہ سال سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے جگت کشنی سے میری وابستگی کا ذکر کیا تو کوئی کٹر صاحب کہنے لگے شکل صاحب بن اخبار میرا یہ ہے اس میں میرے خلاف اتنی گندی باتیں کیوں بھیجی ہیں انھیں معلوم ہوئی تو بڑھ چلا کہ مجھ سے چھپنے۔ جگت کشنی کے ایڈیٹر میں ایک صاحب مولاج ٹڈن لکھتے تھے جو ڈاکٹر سترہ سال اور ان کی سیاست سے سخت اختلاف رکھتے تھے۔ ڈاکٹر کیرانہ سترہ سال نے ڈاکٹر صاحب سے نئی صورت حال کا ذکر کیا تو بڑے خوش ہوئے اور اس کے بعد ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لیکن یہ چھوٹے اخباری کی اس ادارتی ڈاکٹر صاحب کا ایک اور خورج تھا کہ ان میں بالکل منفرد قسم کی باتیں چھپنے پر ان اخبار کے مالکوں کو کوئی حیرت ہوتی ہے اور داس کے پڑھنے والوں کو لکھنے والا خواہا ہے جس میں کچھ بھی لکھتا رہے لیکن پڑھنے والا ملکی جزائش صرف ایک طرفوں کی تصویر دلا اور ان کی زندگی کے متعلق سو کہیں افواہوں کے سوا اور کسی چیز کے متعلق تو نہیں لکھتا۔

ملکی جرائم میں یہ عام رواج ہے کہ اساتذہ اور انھیں وغیرہ کو بی جا

سے بے محنت نقل کرنی جاتی ہیں، جگت کھنسی میں بھی ہوتا تھا۔ اور
 شاعروں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ اسے خوش ہوتے دیکھ کر
 انھیں مزید شہرت ملی دیتی ہے۔ کرشن چندر میر سے دوست تھے ان کا ہر افسانہ
 میں جگت کھنسی میں نقل کر دیا کرتا تھا۔ ایک بار انھوں نے قبر کے عنوان سے ایک
 افسانہ لکھا۔ میں نے اس افسانے کو پہلی بار پڑھ کر اس کا نام بھی لکھ دیا
 مضاف بھی قائم کر دیا جس میں دو جگت کھنسی کا یہ شاعر شایع ہوا اس کے دوسرے
 قیسے سے دن کرشن چندر اور کینیا نالی کچھ سے ملاقات ہوئی تو کچھ دیر ہی طبع رجم تھے۔
 پورا تھا کہ کرشن چندر نے کہا میں اس کا ہی نہیں بلکہ ان کے گاؤں کا نام بھی لکھ دیا
 تھا۔ یہ کہانی پہلی کہانی کے نام سے شایع ہوئی تو پھر میر صاحب کی ان کے دوست لکھا
 اور جاننے والوں میں کافی رسوائی ہوئی۔ بہرحال کچھ کا فائدہ یہ نہیں ہوا کہ وہ
 جدیدی میں گئے۔ کہنے لگے کہ جب میں نے یہ پرچہ دیکھا تو پہلے ہی میں آئی کہ اس کی
 تمام کہانیاں غریب کر جاتی ہیں لیکن پھر سوچا کہ اس سے تو جگت کھنسی کو اتنا فائدہ
 پہنچے گا۔ مقدمے کی سوچیں تو خیال آیا کہ اور رسوائی ہوگی۔ تمہیں پریشاں ہی ہے
 نہیں مگر کہ مجھ سے واقف ہو بہذا دعوت ہی کیے وقتا ہوں۔

شاہکار سے دیکھنی میر سے پہلے اس اعتبار سے پرچہ، اہم تھی کہ اب ادبی
 دنیا کے ساتھ میرا باقاعدہ تعلق قائم ہو گیا، میں نے ایک اصول سامنا کیا تھا کہ
 بے طلب ہوں کہ میں نہیں تھا کہ کرشن چندر نے میر لکھنا "ادب لطیف" کے
 مالکوں پر دعویٰ کیا اور چودھری برکت علی روم سے کہ: "خدا کی طرف سے کامیابی

فراموش ہوئی میر کی نظم "ادب لطیف" کے مسائل میں بھی میر نور علی میر
 میں شایع ہوا۔ ایک ناول کرشن چندر نے ادبی دنیا کے لیے دے آئے تھے۔ میر نے
 نمایاں طور پر شایع کیا۔ یہ ناول بھی مسائل سے ہی میں شایع ہوئی اور میر نے افسانوں
 کا نام اس کا کر دیا بھی کیا۔ ایک ناول "باجندہ گنگہ بیدی" نے مجھ سے لے کر "ساقی"
 دلی کو پہنچ دیا جو وہاں بھی نمایاں طور پر شایع ہوئی۔ چودھری انور کے ساتھ تو کرشن
 چندر "کھنسی نالی کینیا" اور "باجندہ گنگہ بیدی" کی وجہ سے باقاعدہ طعنا کر رہے
 تھے اور "شاہکار" کے علاوہ "ادب لطیف" میں بھی یہ کام قریب قریب
 باقاعدگی سے شایع ہونے لگا۔

شاہکار سے "ادب لطیف" سے کچھ ہی پہلے میں نے کچھ فرانسیسی افسانوں کو
 اردو کے طالب میں ڈھال دیا تھا۔ ہندوستانی ماحول کے مطابق میں نے ان
 کے چارٹ میں بھی کچھ تبدیلی کر دی تھی اور مضاف بھی بدل دیے تھے۔ میں نے
 انھیں بچہ کے کچھ چودھری انور کو دے دیے تھے انھوں نے "بھول" اور "کاسٹ"
 کے نام سے کینیا "ادب لطیف" سے شایع کر دیا۔ اس پر ہونا ناگوار رہنے
 تقریباً کچھ گھر دی جس میں انھوں نے ہرگز نظر دیکھ کر کافی تعریف کی تھی۔
 اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی لکھا کہ میں اگر چاہتا تو ان افسانوں کو مجھ کو
 لکھ کر پیش کر سکتا تھا لیکن میر سے اس احترام نے کہ یہ افسانے اور کینیا
 نہیں ترجمہ کرے۔ مجھے ان تمام افسانہ نگاروں سے ستارہ کر دیا ہے جو پڑھتے
 دالوں کی "میر" سے خبری، پرچہ دوسرے کے ترجمہ شدہ افسانوں کو اور میر
 کی حیثیت سے پیش کر دیتے ہیں۔

یہ کام ان دنوں کافی دیر سے پانی پر ہوتا تھا اور قاضی عبدالغفار اس سلسلے میں خصوصیت سے درہم تھے۔ باقی افسانہ نگار بھی دوسرے افسانہ نگاروں کی مشابہت فکر کو اپنا مال سمجھنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے اور وہ پس اس کا ہدف خصوصاً تھا۔ مجھے یاد چڑتا ہے کہ ایک مرتبہ کرشن چندر نے وہ پس کے ایک افسانے کی مجھ سے بڑی تعریف کی تھا کہ اس کا پلاٹ کچھ اس قسم کا تھا کہ مہاجرین کا ایک قافلہ سرحد کو عبور کرنا چاہتا ہے لیکن سرحد پر جو فکس شخص ہے وہ قافلے کو سرحد پار کرنے کی قسمت غائب کرنا ہے۔ قسمت یہ ہے کہ قافلے کی ایک لڑکی اپنی عزت اسے دے دے قافلہ لے افسانہ اور قاضی کے نام پر لڑکی کو ایسے کرنے پر آمادہ کر لیتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی سرحد پار ہو جاتی ہے وہ اس آلودہ فحش لڑکی سے خدات کا سواغہ لے کر لپکتے ہیں۔ میں اور کرشن چندر کئی دن تک اس افسانے کا ذکر کرتے رہے۔ پھر رات آنی لگی ہو گئی۔ لیکن ایک دن کو فحش لڑکی کے افسانہ کا نام افسانہ نگار میں کا عنوان طعناں پڑا۔ اسے افسانہ اس کے اور وہ پس کے افسانے کے پلاٹ میں نمایاں مشابہت لگتی۔

ابوندہ بیٹا رگھو اس سلسلے میں ایک درجے کا قصور ہی افسانے نگاران کی یہ درپردہ عادت ہے کہ وہ دوستوں کی بات چیت میں سے افسانے کا پلاٹ ہموئر لٹریچر کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس کی تشکیل کے معاملے میں بھی جہاں کہیں سے صحن ہوا افسانہ کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ ان کی اس عادت کے پیش نظر کھٹیا افسانہ نگاروں میں ایک راجہ پرورد پرکاش پنڈت نے ان کے خلاف ایک ایسی سازش

کی جس نے انھیں بڑی طرہ سے دھوکا دیا۔

ایک دن علی امین بیٹا رگھو افسانہ نگاروں کے گھر پہنچے تو کھودنے چائے وغیرہ سے ان کی خاص طور پر دوست کی اور چائے نوشی کے وہاں پہنچ کر ان کو یہ گئی کہا کہ رات ان کے دوست میں ایک پلاٹ اپنا ہے اگر وہ افسانہ نگار ہوتے تو ضرور افسانہ لکھتے۔ بیٹا رگھو کے افسانہ نگاروں نے بتایا کہ پلاٹ کچھ اس قسم کا ہے کہ ایک کوچان کا چان لڑکا مر جاتا ہے وہ کوچو کو بتا کر کہنے کے لیے کسی حدود کی تلاش میں ہے جہاں تک وہ پہنچتا تھا یہ سب کر پھر کر اٹھے اور افسانہ لکھنے پر آمادہ ہو گئے۔ وہاں سے اٹھ کر بیٹا رگھو پرکاش پنڈت سے ملے۔ اس نے بھی ان کی خوب آؤ بھگت کی اور سرسری طور پر پوچھا کہ کیا کوئی نیا افسانہ لکھ رہے ہو۔ بیٹا رگھو نے پلاٹ کا ذکر کیا تو پرکاش پنڈت کہنے لگے کہ ہاں پلاٹ تو خوب ہے۔ اس کے لیے جو افسانہ بھی لکھ سکیں نہیں غلامیہ کو کوچان اپنے بچے کی موت کا ذکر کرنے کا نام کی سوا۔ کوچان سے کرنا ہی جتا ہے لیکن وہ اس کی بات پر توجہ نہیں دیتے۔ سوائے افسانے کے افسانہ نگار کا۔ چلنا ہے۔ یعنی یہ لکھ کوچان اپنا قلم کچھ سنا ہے۔ اس کا قصور کوکون جتا ہے۔ ظاہر ہے کہ افسانہ نگار لکھ چکے ہیں۔ میں نہیں اس لیے غلطی انھیں کوکون ہوئے نا ہو گا۔

شام کو بیٹا رگھو نے کھیتوں میں عبور اور پرکاش پنڈت سے حاصل کردہ مواد میں راجہ پرورد پرکاش اپنا اختتام پر بحث ہونے لگی۔ ورتہ رہا یہ کہ رگھو پرکاش نے افسانہ نگاروں کو ایک ایک پلاٹ کے لیے سوچنے کی غرض سے افسانہ نگاروں کو بتایا ہے۔ کوچان اپنا قلم لکھنے کے کام میں جتا ہے۔ بیٹا رگھو پھر کر اٹھے۔ اب افسانہ نگاروں کو

لکھوان کی فراڈیت سے بالائی کسی شخص نے مولانا کو ایک صاحب خواں
موضوع پر اسے ایک خط لکھا تھا جس سے تھے لیکن اپنی کاپی کے منصب اس ارادے کو
عملی جامہ پہناتے۔

انہی دنوں توحید مکتوبی اور کتاب پانی پتی سے پہلی ملاقات ہوئی۔ مولانا
امروہہ میں اپنے سفر سے واپس صاحب کے وہ صاحب تھے جو مولانا کے ایک صاحب
راہنہ اور مددگار تھے۔ ان کے تعلق سے مولانا کی شخصیت پر مولانا صاحب
چاہتے تھے کہ ان کے ساتھ اپنی ملاقات کے جائز اور اس واسطے یہ وہاں
تھے۔ مولانا نے یہ بھی پس منہج و مخالف کے ایک مولانا پر شاہدے میراں
سے تہارف کرادیا۔

ان دنوں حضرات سے میری پہلی ملاقات بھی یہیں ہوئی۔ خدا کے ارادے سے
بہت جلد وہ مجھ سے بہت غلطی ہو گئی۔ انھیں شکایت تھی کہ مولانا تو انھیں نظر انداز کرتے
ہی ہیں لیکن میں ہندو ہوں اور انھیں نظر انداز کرنا ہمارا کام ہے۔ یہ ساری
دیکھ کر ان دنوں میں سے کسی صاحب کی کوئی چیز نہ لکھا۔ انہی دنوں
میں کسی سے ستر و کثر یہ لکھنا شروع کیا۔ مولانا نے اس کے
مزا اور ہنساؤ کو دیکھا اور خدا و مراد کو باقی کرنے کے بعد وہاں سے اٹھا آیا۔
جہاں ایک شاہکار لکھنا عام پائیس کا تعلق ہے اس پر یہ الزام تو لگے سکتا
خدا و مراد پر لکھنے والوں کو لایا اور ہمت دے دیا۔ مولانا نے لکھا کہ
اس کی ترقی اس کے خلاف پہلے نہ ہو سکتی تھی۔ اس ارادے کے لیے میرا تقریر

خود مولانا خود کی بے قصی کا بغور تھا۔ اس سے پہلے بڑا کام مولانا کو اپنی
دنیا کے زمانے میں مولانا کے نائب رہ چکے تھے جنہیں انھوں نے اپنی طرف سے
لسانہ اعجاز کا لقب دیا تھا۔ ان کے حق میں اتنا مؤثر ہو گیا تھا کہ مولانا
غرضی خاں کے قلم سے بھی جرہ و دلوں کے خلاف شمشیر کی طرح چلتا تھا۔ پھر وہ کل
گیا تھا۔

شکر کے کاسنیہ سیکھ مولانا سے

اسی طرح اسے سنگھ خان اور کرپال سنگھ بیکار کو بھی اور چاہنے میں
مولانا نے اپنی جگہ کی کاؤز و لکھا۔ ان دنوں مولانا کو مولانا نے انھیں
لکھتے تھے اور کرپال سنگھ بیکار مولانا کی تعریف سے اسے متاثر ہوئے تھے کہ
اپنے آپ کو انہی کا تہمتا میں ہی نہیں بلکہ ان سے نسبتاً بہتر شاہی سمجھتے تھے
مولانا نے کسی موقع میں ان کے متعلق کہہ دیا تھا کہ انہی کے کلام میں یہی ہوتی
ہے لیکن بیکار کے کلام میں یہی ہے۔ بیکار صاحب نے اسے ان کی ناقص رائے
سمجھ لیا اور غلطیوں میں اس پر ایمان لے آئے۔

غیر مسلم خاندانوں کے خلاف اختیار کرتا تھا کہ مولانا تو ہمیشہ اس کو خوش
میرہتے تھے کہ انھیں بلوچوں، راجپوتوں کو سامنے لایا جائے۔ مولانا نے یہ کہہ دیا
ہی چند اختر کو چھوڑ کر ایک بھی اچھا لکھنے والا نہ دیا۔ اس کے نہیں تھا جس کا تعاون
بہت زیادہ کرنا حاصل نہ ہوا اور چلتا ہی چند اختر کے معاملے میں بھی جو چیز و عوار
ہی تھی وہ وہاں نہیں تھا بلکہ مولانا نے ان کو اور جناب حضرت صاحب دھرم کی
غیر ختم جنگ تھی حضرت صاحب کے حق میں اور مولانا کے خلاف حضرت اپنے قسم اور اپنی

زبان و زور کا دھڑاستمال کرتے تھے۔ زبان سے کبھی کوئی چیز طلب کی گئی اور نہ
انہوں نے کبھی پیچھے دیکھا۔ وہ اپنے شاہکار سے یہ شکایت نہیں بھی نہیں ہوئی کہ وہ
غیر مسلم اپنی قوم کو نظر انداز کرتا ہے، بلکہ انہیں تو یہ خیال یہ تھا کہ شاہکار دستِ اعظم
کے ہندوؤں اور سکھوں کو بھی شاعر بنا دیتا ہے۔

لکھنے والوں کو اکثر اپنی صلاحیتوں کا سبب انداز میں احساس ہوتا ہے اور وہ
اس وجہ سے جلد جوتے ہیں کہ دنیا نے ان کی جلد ساقی کے لیے کوئی سراوش کر
رکھی ہے۔ جو تا کام ادیب غیر مسلم ہوتے ہیں انہیں اپنی کامیابی میں مسلمانوں کے
سازش نظر آتی ہے۔ سلطان ادیب اپنی کامیابی کا باعث فرقہ پرستی کو تو قرار نہیں
دے سکتے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کچھ مشکافی زبان ہوتے ہیں، چنانچہ عوام
ادیب کو ہی اکثر سے دہرہ ہوتے ہیں انہیں اکثر یہ شکایت لاحق رہتی ہے کہ مکران لکھ
ان کے خلاف مصروف سازش ہیں اور انہیں اصرار کرنے کا موقع نہیں دیتے۔ جیسے جیسے
دوسروں کی طرف سے ان کے خلاف سازشیں ہوتی رہتی ہیں وہ دیکھ دیکھ اپنی طاقت
کا احساس بھی قوی تر ہوتا جاتا ہے۔

مزاں کو اتنی پیچیدگی نہ ہو جو پہلے سمجھ دے کہ اس میں آخر شخص کرتے تھے چنانچہ
کی صورت پر ہی سے بہت دلاس تھے اور مخصوص دل سے یہ سمجھتے تھے کہ اقبال کی فکر
معمولاً بہت پرچا بیوں کی صورت پر جستی ہی کا کرشمہ ہے۔ ایک مرتبہ وہ خانہ کار
کے دفتر میں شریفی لکھنے کو کہتا ہے اور وہ لاہور سے بہت دور تھے جو ان کے عزیز
میرزا حسن خان علی قلم کی تصانیف کا شائق کرنا تھا مجھے معلوم تھا کہ یہ بات
حقائق کے خلاف ہے کیونکہ میرزا حسن نے وہاں اور قلم کی کئی اور تصانیف لکھی ہیں

خانہ کی انہیں اور قلم کی آبادی کا تو اس نے پورا سمیٹ خالی کر دیا تھا میں
ان کی جذباتی تصنیف، روحِ ادب، بھی شامل تھی گفت و گو کی اٹھ کر صاحب
اور مولانا میں چور کا تھی اس لیے میں خاموش رہا لیکن خاتمِ کتب کے
بالکچہ دھری ہو گئی تھی سے طاقت ہوئی تو باتوں باتوں میں میرا حق سنا
کہ یہ بھی صاحب معلوم کرنے کی کوشش کی۔ پتہ چلا کہ ان کی نظموں کا مقبول
اشاعت کے لیے موصول ہوا تھا جو انہیں ٹوٹا دیا گیا، ماس میں صوبائی نقشب
کو کوئی دلیل نہیں تھا مگر جو دھری صاحب جو انہیں اصرار سے تعلق رکھتے تھے،
ذاتی طور پر ان صاحب کے مذاج تھے لیکن ان کے بالکچہ کی حیثیت سے وہ یہ
جانتے تھے کہ ان صاحب کا کلام مشاعروں اور کاغذوں کے مینوس ہیں تو
داد و مولیٰ کو سنا ہے چھپ کر ایک نہیں سکتا اور کوئی پبلشرس کتاب کو کاغذ
بکھرا کر شائع نہیں کرتا۔

میرزا حسن کا میر کوثر میں ایک صاحب سفینہ بغیر حسن تھے جو بغیر شخص
کرتے تھے۔ وہ ریاست کے ممتاز سردار تھے، پڑھے لکھے تھے اور سید
اور عرفان مقرر کیے کی صلاحیت رکھتے تھے لیکن جہانگیرہ اور ذی قلم ہونے
کے باوجود اس خانہ میں جلد تھے کہ ہندوستان میں ان کی فکر کا ایک ہی شاعر
ہیں۔ وہ لاہور اس وقت اقبال، یاقین، یگانہ، ذائقہ، مسکرا اور مسرت کے سبھی
نہہ تھے۔

کچھ شاعر اسے بھی ہوتے تھے جو اپنی جلد صلاحیتوں کے باوجود گونستہ
گنا می ہیں ذائقہ کی گزرتی ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ وہ شاعر کی زبان نہیں

بن لگو دیتا، اور ملکی کریم اور دوسرے شیخ دیکھتے تو خوش ہو کر لپٹے : اب یہ ہے
اب میں دیکھتا ہوں کہ کتنے ہوں وہاں شریعت اچھی لکھتے تھے اور اور دلوں کا
ان کا مطالعہ بھی کافی تھا لیکن تھنہ دی ان کے مزاج پر تھی غالب ملکی کا ہر کر
کار کر ان کے پس میں نہیں تھا۔ یہ ان کے صفا فنی کمال کو بڑا اعتراض تھا کہ
"مرد" کے ادارے میں بھی جہاں ہر قسم کا فنی تھنہ گراں تھا ان کی بے غنا جگہ
پر دوست کر لی جاتی تھیں۔ دلی اگرچہ وہ چندوں "ادب" میں ملزم رہے ایک
مترجمین ایڈیٹر پر بھی بیٹھے اور یہ کہ چلے گئے تھیں کاپی جوڑنے کے سوا
کچھ بھی کر رہے تھے۔ لیکن شریعت ایڈیٹر کو بھروسہ نہ کیا۔ وہ کچھ شایہ چھڑا سوائے
فالج رہا ہے۔ اس نے سوائے ناچنے کی کسی دھن نہ سکھائی تھی۔ اس صحت کو
شیرنگار کا شوق میں غلط بات کہہ دی۔ میں نے کہا تھا کہ آپ کو کاپی جوڑنا
آتی ہے مگر یہ یہ ہے کہ آپ کو کاپی جوڑنا بھی نہیں آتی۔"

ہزارہا میں حسرت اس مجلس کے سر رہے۔ انھوں نے سوچا کہ ابوالکلام آزاد
کے ساتھ اہل دلی میں کام کیا تھا۔ راجندر رامی وہ کتابیات کے عنوان سے
موجود کام لکھتے تھے جس کی ان دنوں بڑی دھوم تھی۔ اس کام میں اتحاد پارٹی کا انھوں
نے جو قصیدہ لکھا تھا وہ زبان خود خاص و عام تھا :

تیرا یار فرستد نا تھا ! اتحاد پارٹی

سارے کوئی تیرے ساتھ ! اتحاد پارٹی

ہے اسی انداز میں انھوں نے پنجاب کا یہی جوا فیر بھی لکھ لکھا۔
میں میں پنجاب کی یہی کسی شخصیتوں بہ بہت دلچسپ پڑیں گی انھیں۔ اند

زبان پر انھیں، بلکہ جہود تھا کہ وہ ان کی کہانیاں بھی لکھی تھیں۔ یہ کہانیاں انھوں
نے فیض اردو میں لکھی تھیں لیکن اگر کسی کتاب کو دیکھا تو یہ چاہا وہ بھلا
تو بند کر دے انھیں ہندی کا ڈاکھا دی ماننے پر مجبور ہو جاتے۔ ادب اور
یہاں میں ان کی معلومات بھی دافتر تھیں۔ تھوڑی تھا کہ یہاں آوی جتا ہے
زلم ہو جائے چنانچہ وہ اپنے سوا کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور قول و فعل
کے ہر قصدا کو اپنے پیسے سے مار دیتے تھے۔ یہ ان کا عام شیوہ تھا کہ دشمنان کے دلوں
میں خوب ہوش میں جانے کی یہاں سامنے دکھ دیتے۔ چکیاں لپٹتے رہتے اور
دشمن کے غنائی بیان کرتے جاتے۔ ان کے کمال کے بھی معترف تھے اس
پے کوئی حوت گیری نہیں کرتے تھا۔

یہی ان کی صفات تھیں۔ جندوگ جھونک سے ہوئی۔ لکھے ان دنوں نزل
اکثر رہا تھا کہ جس نے لکھے جھونک دیکھا تو ان کے نرے کا ترہت جان کسی مشہور
ڈاکٹر نے یہ بتایا ہے کہ ان کی سر پر لکھی ہوا تھیں تھیں۔ میں نے اس لکھے پر عمل
کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ انھیں انوں خوب ہوش میں میری تھوڑی دھمکتی فرما دیا ہوئی۔
اور انھیں نزل تھا کہ حسرت صاحب نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا کر کہا۔
"جو تھی جی، اندامیرا ہاتھ تو دیکھ دیجئے" میں نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا
اور چند منٹ فوٹو دیکھنے کے بعد صاحب دیا۔ حسرت صاحب میں مجبور ہوئی
آپ نے تو کثرت استغاثہ سے اپنے ہاتھ کی گیریں ہی مٹا ڈالی ہیں۔ ادب
ہوش کے غلط و غلط کے طوفان میں ان کی سخن بگڑ گئی تھی۔ میرے فقرے پر
اس دور کے چھپنے والے کہ مجتہد ہل گئی۔ خود حسرت صاحب نے بھی

پرا جاتی تھی۔ احسان دانتی کے ایک شاگرد نے سوچ، وہ دانسے کے پاس منزل
لے گا، ایک میٹروں کوں رکھا، اسکی کھلی کندروں کا نکلنا دیکھ کر جاکر
ایک دین پھل میں لکھتی تھی اور سب سمون دنیا کی حیرت کا خالق ڈایا جارہا تھا
کہ کیا ایک ایک ٹوپو جس کی طرح اسے اور خالی کر کے پرہیز کر جو حق سمیت
ہیٹے دونوں پاؤں فلسفہ دلہانی بن رہے تھے۔ وہ خاکسار فکر کے میں بنایا
مثال ہو تھا اور یہ دیکھ کر اسے ہلہ ختم ہوا، اس کا ایک سیاہ ستارہ نماں
کا ذکر اس کے حوش سے کسے ہی جھوٹے ہی کہنے لگا، تم کو ایک ہے جو
میں نہیں تھیں کہ وہ کیا؟ اس سے تو چھائی کیا؟ خواہے وہ تھیں کیوں ہے کہ وہ تھیں
یہ جو کہ مقتول نہیں تو ہوا؟ میں سچا مسلمان ہوں کہ تھیں ہوا تھیں جنت میں
باؤں کا۔ میں مرنے پر میری رگ غرافت بھول کر، اور مہینا نہ انداز میں اس سے
کہنے لگا، صاحب اس عمر میں جنت میں نہ جانا، جنتی کہیں آپ کو غفلت نہ جانی۔
اس فقرے پر کلمہ نہ دل کا جو حال ہوا وہ تو ظاہر ہے کہیں اس نوجوان کا روشن
بھی مزہ اشتعال کی بجائے محراب کی کسی میں خیر ہوا کہ کوئی تین چار ہفتے کے بعد
مجھے انداز کی بل تو بالکل بلا ہوا تھا۔ بڑی گرمی تھی۔ ساتھ کر کیا اسے اور دانا
انداز میں کہنے لگا۔ ختم صاحب، میں نے وہ سب کچھ عبور کر دیا ہے۔ اب میں
غریب بیٹا ہوں۔ جانا سنا ہوں۔ وہ میں نے بار بار دیکھ لیا ہے کہ تنہا یہ طریقہ
جب ایک تنہا پسندانہ روش کو خیر یاد کرتی ہیں تو فوراً ہی وہ دوسری تنہا پر
بیچہ مانی ہیں کہ احسان ہوا کی طور پر کہیں وہ اپنی نہیں؟

تفسر دویب دینا اور فیما بے بیگانہ نشانی کا نامی میں سرشار تھے۔ زندگی کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ اپنی کجی کو کلاسی کی روش کو زبرد اور کھا جائے۔ سراج سے ان کا رویہ صرف اسی سرنگ تھا جو جسم اور جان کا راستہ قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا۔ یہاں پہلے ہیٹ پائے گئے کسی اخبار کے دفتر میں چھٹی یا ڈیڑھ گھنٹہ کر لیا کسی پبلشر کے لیے ترجمہ کر دینا یا کوئی کتاب یا مضمون مرتب کر دینا کامیابی کو یہ لوگ شک و شبہ کی غلطی سے دیکھتے تھے کیونکہ یہی تھے اخبار کامیابی یا ناکامی کے معیار ہی سے حاصل ہوتی تھے۔ ان میں کبھی کسی بات پر اتفاق ہوتے دیکھا نہ تھا۔ اتفاق اس لیے نہیں ہوتا کہ سب وفاق ملک اخبارات کی پیش تھے۔ وہ جگہ اور نہیں ہوتا تھا کہ ان کے نزدیک کسی کو فائدہ کی باتیں ہی نہیں ہوتا تھا کسی کو فائدہ کی باتیں ان کے نزدیک اس کی افراط و تفریط میں خلعت تھی۔ حاصل زندگی یہ تھا کہ غلطیوں کوئی نہیں ہوا تھا کہ وہ یہاں کے یا کوئی آداب یا روکھ نہ دیا جائے جو آداب جتنا زیادہ غیر معروف ہوتا تھا اتنی ہی اسے زیادہ دلچسپی تھی۔ یہ بھی ایک طرح سے ان کا نامی کی برکت تھی۔

یہ اس زمانے کا کمالیہ تھا۔ ڈاکٹر یوں ہی عمل کر جاتے تھے اور ہر کے
کلیاں اٹھوں میں بار بار بے کسر دو گت جوت بہت عمدہ شعر کہتے تھے اور بار کو
میں بے نور چمکے کتنا اچھا سیدھے تھے کہ گمراہ کی تربیت ہو جاتی تو بیکال
مفتی ثابت ہوئے۔ اس زمانے میں میں اپنے فرائض کا تقاضا بھی ختم نہیں ہوا۔ کسی
نیکو کی اصل کو نہیں ہی کو سٹش کی معجزانہ تھی۔ منہ اور اس شخص چہرے تھے۔ مگر بعض
لوگ تاخیر یا سستی بھی کرتے تھے۔ یہ اپنے فرائض تہجد اور نماز اور بعض دیگر عبادت

کو اپنے لیے امانت ننگ کہتے تھے۔ حکام میں خا عازم زمانے میں بھی گئے
لیکن ادنیٰ ملتوں میں انھیں ذوقِ عالی تقلید بھی جانا تھا۔ تخیل رنگ۔

ماویٰ اعتبار سے کامیاب ترین شاعر حقیقہ جاندہ صری تھے۔ وہ شاہنشاہِ اسلام
محمد کو معزز کی صف میں شامل ہو گئے تھے اور اسی کو کئی بھی جلال تھی لیکن اسی کا
کامیابی پر فخر کرتے انھیں کسی نہیں دیکھا دوستوں سے دوستوں ہی کی طرح تھے
اور اپنے معزز ہونے کا احساس نہ کرنے کے لیے کفر ضلعِ جلالت پر بھی آجاتے
شعر بھی وہ بدستور غنت سے کہتے تھے اور مستند ہے میر فرمایا جواہر کے مقبولے
پر عمل پیدا نہیں تھے۔ بلند اُن سے ہر حال انہی تھے اور کاشف بھی سمجھا جاتا تھا کہ ان
کی کامیابی میں صرف ان کی خوش گویا گو دخل ہے۔ اس عام غلط فہمی سے میر شاعر کو ناگزیر
پہنچا وہ احسان دانش تھے۔ احسان دانش خوش گویا تھے بے حد ممتی تھے اور عقیدان
وضوح کہتے تھے کافی دیر تک وہ محنت مزدوری کے کپٹ پائے رہے
تھے اور خود کو مزدور شاعر کہتے تھے خوش گویا کے سوا ابی تمام باقی میں وہ
حقیقہ جاندہ صری کی قدر تھے۔ ہر طرح وہیں تمام لوگوں کے لیے جو ناکامی کو خوشی
اور کامیابی کو ایک طرح کا جرم کہتے تھے۔ ہر روز گئے اور شاعروں میں انھیں
حقیقہ کے مقابلے میں اتفاقاً اور وہی جانے لگی حقیقہ کے ٹرانے قریب سوا نا
تاج محمدی احسان دانش کی مدد کو آگے جو سے ہر میزانِ غنت میں بھی انھیں احسان
کا جلوہ اصرار ہی نظر کرنے لگا۔

ان کا ان دانش حقیقہ سے کامیاب صریف اگرچہ مذہبی تھے لیکن وہ دور
سے انھیں کے کام مزدور تھے۔ ان کی کامیابی پر چھٹی ہو جا۔ ان کی جائے وہ

ہمیشہ یہ کوشش کرتے تھے کہ اپنے آپ کو دوستوں کی مدد و دستکش کا اہل
تاریک کریں انھوں نے زندگی کی ابتدا واقعی مزدوری اور چمکیداری سے لگائی
علم جہاں انھوں نے حاصل کیا اپنی محنت سے۔ یہ سائنس نہیں حقیقت ہے
کہ چمکیداری کے زمانے میں کئی کتابیں انھوں نے پانڈی کی دستکش میں پڑھیں۔ یہ بھی
حقیقت ہے کہ اناس نے ان کی غفلت میں بھی پیدا نہیں کی۔ وہ مردم کار نہیں
ہے۔ دوستوں کے دوست تھے اور باج تھی وہ بھی پچھلے تھے۔ پسہ گنا انھوں
نے محنت ہی سے پیدا کیا۔ میرا کہیں کتب فروشی کی دکان کسی کے سامنے آتا نہیں
بجایا۔ وہ اپنے خاندانی اناس پر نادر نہیں تھے۔ لیکن اناس کو فروشی بھی نہیں سمجھتے تھے
ایک بار ترقی پسندی کے غم میں پرست ہو چکی تھی تو انھوں نے بے تکلفی سے کہہ دیا
تھا کہ میرے نزدیک ترقی کا غم یہ ہے کہ میرا بورے پر پیدا ہوا تھا لیکن انھیں ہر دم
دروں کا۔

آخر شریانی کا ناما شروع ہوا چکا تھا وہ اپنے دور کے مقبول ترین شاعر تھے۔
ایک اسیر اور تھائی دلی دھار باب کے بیٹے تھے صاحبِ ادب اور شاعرانہ ان کے لیے
بیشہ نہیں بدلتا تھے۔ ان کی شاعری کے رد والی احوال ان کی سے خوشی اور آواز
مزا اسی نے انھیں دنیا کے شعر و ادب کا روحانی شہزادہ بنا دیا۔ ان کا شمار ان کی شہزاد
بن آسان ہے لیکن غصہ بنا آسان نہیں۔ لوگ رد والی شہزادے سے محبت
فرقِ الخطرت ہوا۔ انوں کی امید کہتے ہیں اور یہی گوشتِ بدست کے انسان
کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔

اپنے والد و اڈا محمود و حالِ خیرانی سے ان کا قریب قریب قطعِ تعلق ہو چکا

مناظرہ جنہوں میں دوسروں کو پانی کی طرح سٹراب چاٹنا تھا وہ اب شراب کے لیے
دوسروں کا دست نگر تھا اس بنا پر لوگ ان سے کتنی بھی کٹراتے لگے تھے لیکن
پہلو لوگ ان پر اس قسم کے التزام نہ کرتے تھے کہ انھوں نے باقاعدہ دروازہ نگری
شرع و عرو کی تھی وہ غالباً ذاتی طور پر بیان کرنے کی بجائے شعنی مشائی باتیں
کہہ رہے تھے یہاں اختر نے شرف نفس کو بھی ہاتھ سے نہیں ڈالے یہاں روپے پیسے
کو نہ آخر کی وقت ایک محاکمات سے دو ٹکٹے رہے اور بے تکلف دست سوال
برآباد رکھنے کے میں ہی میں نہیں تھا۔

ایک مرتبہ وہ میر کے وقت میں اپنے گھر پر بیٹھا ہوا تھا کہ خیر اختر نے آکر
کہا کہ نیچے اختر شہزادی آپ کا انتظار کر رہے ہیں بیچے کیا تو اختر شہزادی تانگے میں
بیٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے آؤ جنس میں ملے کہا اور جا کر کپڑے بدل آؤں۔
کہنے لگے نہیں دیکھتی چلو میں ان کی بات کو کم ہی ٹوٹا تھا۔ تانگے میں بیٹھ
گیا جب تانگہ آدھ ٹھپنے کے قریب پہنچا کہ تو میں نے سوچا کہ آخر کہاں جانا
ہے ہاتھ گرہ کاٹے کیوں نہیں؟ بولے پیسے جو نہیں، میں نے کہا اختر صاحب
میں نے کپڑے بدلنے کی بات کہی تھی تو مطلب یہی تھا کہ کچھ پیسے لے لوں۔

آپ کے انکار پر میں سمجھا کہ ضرورت نہیں، ہر حال تانگہ اس وقت دارگاہ میں
سے تازہ دم تھا، دلوں میر سے ایک عزیز کی روک ٹوک میں نے اس سے چند رو

روپے ادا کر دے لیے۔ مختصر سے یہاں فاصلہ بڑھ گیا کہ اختر شہزادی ایک اختر کی
نظر میں تیرے چچائی، منیر انھیں اپنے دفتر میں لے گئے اور جب وہ وہاں گئے تو ان
کی حسیب بندہ اس روپے کا ٹوٹ چاہا لیکن خاتم تک ہر سب روپے خرچ ہو چکے
تھے۔ جو بھی ملا اختر نے اس کی دعوت کر ڈالی۔

اختر ملا غرض بھی تھا کہ وہ کوئی بھی نہیں بلکہ انتہائی شریف تھے۔ میں نے ان کی
زبان کے کسی خاتون کے لیے نازیبا کچھ نہیں سنا اور ان کی عشق کی داستانیں
بھی اکثر قیاس کو ہیں۔ سخی، عذرا، ارمان، ایک شاعر کے ذہنی ہیرو بولے تھے بہت
میں نے کہ ان کا پرانا اختر نے عزو آگاہیں، دیکھ لیا ہو لیکن وہ پوری طرح نازی
طور پر مشغول تھی نہیں ہوئے۔ اختر مصوف کی شاعری کے تحت غلاف تھے اور
ایک مرتبہ ان کے کہنے سے میں نے اختر مصوف کا ایک شعر درج کر رکھا تھا کہ تو
سے سخت پرہیز ہوتا ہے تھے لیکن کثرت کی جہانیت کے وہ ذرا تامل نہیں تھے
ان کی شاعری سے محبت کا جو پتلا بھرتا ہے وہ اس کی اہمیت کا بے حس کا
سب سے بڑا ثبوت اور انھیں ہے جو انھوں نے ایک شاعرہ کی شادی پر انھیں
ہے۔ اس نظم میں شکایت نہیں ہے کہ وہ اختر کی بجائے کسی اور کی ہوگی جبکہ انھیں
میں اس بات کا بے شاعرہ لیکن صبر و شفقت جہانیت محبت میں آلودہ کیوں ہوگی۔

محبوبت میں دوسروں کو روکا بھی گئی

تیرے بستر پر بھی آکر کھنکھائی گئی

میں نے اختر کو اپنی بڑی ہرج مہرجاب، طوائف کے کوٹھے پر بھی میں
لے انھیں بھی ضرورت سے زیادہ بے تکلف، موٹے نہیں دیکھا، اگر بہت زیادہ ہے

میں ان دنوں ملاپ، دلی میں کام کرتے ہیں اس وقت لاہور میں اخبار نویس
کرتے تھے شعر بھی کہتے ہیں۔

ہوتے تو اس کا ہاتھ پیٹنے سے لگا کر وہ بخیر فرما کر دیتے ایسے سوتھو پر پھر
اکثر ان کے درد زبان ہوتا تھا:

کیسے خانہ خراب ہوا ہم لوگ

جو خوش اور باہالی تھی کہ روایت کے نئے وارث عہد امید ہم تھے اختر
شرابی کی طرح ہو کر جیتی بھرتی ہوئی تھے طبیعت ایک انتہائی مرزبان تھی ملا کے
زور کو تھے اور بہت عہد خضر بنے کھنٹی سے کہہ جاتے تھے خراب سے انھیں
بہت تعلق تھا ہر وقت جیتے تھے بے تحاشہ جیتے تھے لیکن خراب ان پر بالعموم
کوئی ناگوار غور نہیں ڈالتی تھی ان کے بہترین اشتیاق بھی خراب ہی کے موضوعات
پر مرکب تھے

پہلے اے خیم دریاں اور بخانا ہے نزدیک
آرامتے چلیں گے ذرا بات کر س گے

ظالمین سے ڈر کر رستے میں
دوستی ہے سفر اب جانے کی

میں میکہ تنگ راہ سے چو کر نکل گیا
درد سفریات کا کتنا طویل ستا

میں خاندانوں کے ساتھ بالعموم شراب نہیں جیتا تھا، اختر شیرازی کے ساتھ
تو ایک دو بار شریک جام ہو گیا لیکن غریب دوستی اور انتہائی طراوت کے باوجود

وہم کے ساتھ تو خوشی و شگفتگی میں گئی نہیں کی خراب دیکھتے ہی الہ پاک
ایسی داشتگی طاری ہو جاتی تھی کہ وہ ہر جسم اور دنیا کو بالائے طاقت رکھ دیتے
تھے میری اپنی زندگی میں بہت بڑے بڑے چھوٹی تھی اس میں بخیر و اسیبت کہ رکھنا تو
غریب تھا اور کمال کھیلنا میرے لیے ممکن نہیں تھا چنانچہ اپنے دستان کے
دربیان ایک عمدہ سا مٹھریں نے پسینہ ڈالی رکھا انھوں نے بھی اس علم کے
باجو کہ میں ناہوشک نہیں ہوں ابھی اپنے ساتھ چپے کے لیے بھی بے سہو
نہیں کیا۔

ایک مرتبہ خراب کے لیے مضطرب تھے، وجہ ان کی کوئی صورت نظر نہیں
آتی تھی میری حیرت میں پیسے نہیں تھے لیکن گھر پر خراب کی نصف بوتل موجود
تھی میرا انھیں یہ کہہ کر اپنے ساتھ لے گیا کہ میرے دوست کو نصف کھانا گھر پر
بھانپنے سے ہوتے تھے اس لیے خراب کے گھر دوازے سے میں باہر نہیں نکلتا
تھکا غور کیے نیچے گراؤں گا اگر تم اپنی کھانے میں کامیاب ہو گئے تو تھوڑی
دور دھری کی یہ مٹاؤ پیش کیے تو شور نہ مچانا اور چپ چاپ چھپے ناہم
خوشی سے وہ گھر کے صبر سے ساتھ چلے لیکن جیسے ہی میرا قدم نکلتا ہوا
نکل آیا وہ بے قابو ہو گئے اور زور سے جھانکے مٹھری صاحب فدا احتیاط سے
بڑی جوت لٹکی تو میری بوتل ٹوٹ جائے گا میں کی پکا لکھڑا ہونے لگا میں نے
پروردہ فاش ہو چکا تھا اب احتیاطاً غریب تھی میں نے کہا: "وہم صاحب ب
درد و نصف نہیں رہا میرا آپ کے لیے جوت لے کر چپے کر رہا ہوں۔"

شراب و ہر مٹھری میں لپٹے تھے وہ صحت نامش کی ان پر کڑی نہیں

گرنے کی تھی۔ مگر باوجود ان کی کئی بات میں وہ اتنے گھبراتے تھے کہ میرا دلانی وہاں کے لیے
 کوئی حقیقت نہ تھی نہ کسی بھی ایک مرتبہ کے ہاتھ لگنے کے سوا کسی طرف سے گئے۔
 منزل ایک قبرستان کا ایک مختصر شہرانی تھا۔ میں نے سب سے پہلے وہاں کے علماء
 نماز کے قریب خلعت لوگ جمع تھے اور ایک خط لکھا ہوا ہونے پر کچھ کارہا تھا۔ واز
 اس کی آواز نہ تھی کہ نائب کا معصوم جس کی صاف ہو چلا۔ وہ پرتیخت لکھنے ایک
 نئے منبر پر کے ساتھ میرے ذہن میں گونجنے لگا۔ میں وہاں منبر کے بعد وہاں سے
 کہہ کہ آیا لیکن بعد میں ان کے ایک دوست نے میرا کام ڈالنا قرآن میں مختص
 مجھے بتایا کہ تم اور اختر شریف کی سبکدوشی کے خلاف میرے کفر جانتے تھے اور اس سبب لڑائی
 صفت مفتی کی کوستی پر ظالم سرور میں مرد ہنسنے تھے۔

ان دونوں کے عزائم میں کوئی ایسی سرشاری نہ تھی جو ہر کوئی بے باک
 دیکھتی مشرب کا گھونٹ ملنے سے اس نے یہی وہ مجرور تارک کی کہ لکھو ہوں سے
 انہیں بوجہ تھا۔ اور اس کی جڑ جیم شہرور میں دیکھ کر قاتل ناچنے لگا تھا جس میں
 حافظہ قیسم تھا۔ اور ان دونوں کے منظر تھے۔

اختر شریف کی بے قیود میں باہر کی دنیا باطل ہی بے حقیقت ہو گئی تھی اور
 ان کے ذہن میں وہاں سے ان کے لیے خطوں کی نظائیں، اعتبار کی تھیں۔ ان سے وہ خواب
 ہی میں نہیں تھے۔ عالم بے باکی میں بھی بے کام رہتے تھے۔ ان دونوں میں کی۔ اس
 ایک گندمی بستی کے شکستہ سے کمرے پر لگتی۔ یہاں بھی کبھی سے چلا جاتا تو کچھ
 سے بچ چھتے کیا جن میں کوئی آواز نہیں آتی۔ پھر کہتے بات اس نے مجھے چوری
 غزل لکھواری۔ وہ بالائی جہاز ہی تھی اور میں کہتا تھا جاتا تھا۔ اسے غل جاس کا نام

دیا جاسکتا ہے لیکن یہ غارتی ماحول پر غلبت کی تسخیر بھی تو ہے۔

شاعروں اور ادیبوں کی طرح مرد کے صفاتی، بالخصوص مسلم صافی بھی
 کو نکال ہی اور فلسفہ کی کو زندگی کی حیران جتنے تھے میں نے پالیسی کی تھی۔ تیار
 کے سبھی اخبار آزاد تھے۔ میں نے خبر اخبار کی اور کاروباری عناصر طبقہ کے پابند
 ضرور تھے۔ مسلمان اخبار اس کے بھی قائل نہیں تھے۔ ان کے دعوے کا انحصار دوست
 غیب یا پیگ کے چندوں پر تھا۔ جب بھی کوئی آزاد پڑتی پیگ سے چندوں کی
 اہل کی جاتی تھی اور یہاں توجہ نہ دیا۔ ماسم سرکاری کتاب کی شکل میں ظاہر
 ہوئی تھی اس لیے پیگ چندہ دینے میں نہیں لگی تھی۔ مولانا ظفر علی خاں
 کے متعلق تو ان کے مخالفین نے مشہور کر دیا تھا کہ جب بھی ان کا خیر تر زمیندار
 ملی مشکلات میں مبتلا ہوتا ہے وہ کوئی اشتعال انگیز چیز نہ کرے۔ اس سرکاری کتاب
 کی زد میں آجاتے تھے۔

مولانا ظفر علی خاں کے نزدیک ان کے دوست دشمن سبھی مارت تھے۔ ان میں
 نظم اور شہر و قلعہ پر کمال و دستہ کا تھی اور معرکہ آرائی میں دونوں اور کامیوں کا
 مقدمہ تھا۔ ان کے مقابلے میں اس کا ہوتا تھا غلام رسول تھراور عبد الجبار
 سالک نے جب زمیندار سے لگ بھگ بھڑکنا تھا اور ان دونوں اخباروں میں
 معرکہ آرائی شروع ہوتی تو وہاں اشتعال کی طرف سے دونوں بیرونیوں کے
 علماء ملامتوری ادیبوں کا مشہور طائفہ آزاد زمیندار لاکھو بھی تیار نہ تھے۔ صرف
 تھا۔ وہاں زمیندار کی طرف سے ہوائی کارروائی تہا ظفر علی خاں ہی کرتے

تھے لیکن دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ اس مرکز میں چڑا کیلئے ظفر علی خاں کا
 ہی سہارا تھا اس مرکز کے دوران میں جب ظفر علی خاں نے یہ کہا تھا کہ ان کا
 کیلئے شکل و اسلوب کی ساری چیزوں سے لڑے گا تو یہ صرف تعلیٰ نہیں تھی
 لیکن ظفر علی خاں کا شکل صرف صوفی خفیہوں کی چیزوں سے ہی نہیں لڑا
 وہ سیاست کے میدان میں بھی کسی سے لڑے نہ پنجاب ہی نہیں ہندوستان
 بھر میں یہی کوئی سیاست پارٹی یا مشہور شخصیت نہیں تھی جو ان کے دار سے
 بھٹ کر رہی ہو جب انسانی یہ ہے کہ انھیں کے قلم سے ان سیاست پارٹیوں
 اور شخصیتوں کی مدح بھی رقم ہوتی ان کا قلم کسی سیاسی منصوبہ بندی کے
 تحت نہیں بلکہ جذبات کے وقتی جوش کے بل پر چلتا تھا خوش ہوئے تو
 تعریف کر دی خفا ہوئے تو بھی کھڑکھڑالی جیسا کہ حق سحر نے اپنی تلامیہ
 تصنیف پنجاب کا حفر فیہ میں ظفر علی خاں کو ایک ایسے دریا سے تشبیہ
 دی تھی جو اپنا ساحل متواتر بنا رہتا ہے جس دور یا میں مسلسل غلبائی رہتی ہو
 اس سے اور ساحل بھی کہا ہو سکتی تھی۔

مجیب بات یہ ہے کہ مولانا کے توفیق کے باعث ان کی مقبولیت میں
 کوئی فرق نہیں آیا جو لوگ ان کی توفیق قلم کے قیل تھے وہ بھی اس کی توفیق کی راہ
 دیتے تھے لوگ ان کی عزت اور اہمیت آواز دے اٹھتے مشعلی تھے کہ ان
 کی دوست عام خلیع مزین برگزار نہیں کرتی تھی یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کے
 جائیداد و غزل کے رواجی محبوب کے اشعار سے نہ بار و بار یاد دلا رہیں بلکہ ان
 کی سبھی سیاسی پارٹیاں ان کی تائید و حمایت کے حصول کے لیے کوشش

رہتی تھیں بہر حال دوسری بار انھیں ظفر علی خاں کا قلم دونوں کا حق اور کڑا تھا
 احمدیوں سے غرض میں نے تولد میلے کے احمدی ایڈیٹر تاج الدین کے سر پر
 "دنیا و دین کا تاج" رکھنے پر آمادہ ہو گئے احمدیوں میں انھیں خیریاں ہی خوب لیں
 انکو آئے تھیں:

اگر اک سیر پلائی ہوئی دلیوار ہوئے
 تو وہ اس عہد کے پنجاب کے احرار ہوئے
 خیال باطل سے اگر ہر سیریکار ہوئے
 تو وہ اسلام کے جانبار رضا کار ہوئے
 انہی احمدیوں سے خفا ہوئے تو ارشاد ہوا:

اندر کے قانون کی پیروی سے بیزار
 کافر سے موالات مسلمان سے بیزار
 اس پر ہے یہ دعوئی کہ میں اسلام کے احرار
 احمدیوں کے یہ ہیں اسلام کے غدار

پنجاب کے احرار اسلام کے غدار
 کانگریس اور رشتہ قومیت پر جان تھا تو آپ نہ مہم میں غلط لگا سنے
 کے ساتھ ساتھ لگا جس ڈانچ لگا باجی خروار کی بھتے تھے اور غلغلا انتخاب
 کے گجا شد و مد سے ڈانچ تھے:

مجلس و انتخاب کو منظور تو کرو
 ہوئے بکا راج اس کے سب کچھ جانیں گے جواب

تم ظلمتوں کے ڈہم سے بچو کتاب میں
اور ماضی ہے حق کا درخشندہ آفتاب
ان دونوں دو ناقوسِ دُعاؤں سے ہے نیاز ہندوستان کے عشق میں
منجھرتے تھے:

ناقوس سے غرض ہے نہ مطلب اقبال سے ہے
نیک کو گر ہے عشق تو ہندوستان سے ہے
تہذیب ہند کا نہیں چشمہ اگر ازل
یہ موج رنگ رنگ پھر آئی کہاں سے ہے
دکھ سے مل کر تلپ ہے تو اس خاکِ پاک کی
سودا میں روٹتی ہے تو اس آسمان سے ہے
لپے ہم لہروں کو ان کا ایک ہی مشورہ سنا:

عسلائی کے سدا سدا کاٹ ڈالو

مرا کر ہندوؤں سے اختلافات

وہ اکثریت سے ملکر شکایت کے بھی خلاف تھے مبادا اس سے اٹھا
میں غریب ہو جائے:

وطن اور اس کی روایات چھپے سے حرفائے

بے غصہ رنگ ہے وہ شیوہ فریاد مجھے

گاندھی جی اور دوسرے کانگریسی لیڈروں کی بھی احوال یہی کہوں
کر تشریف کی لیکن جب کانگریس اور ہندوؤں سے نیاز ہوئے تو ضلعِ بکٹ

چاہا کہے:

سلاؤ گے ہوائی کی چوٹی کو کس سے

اکرم لے لے ایک ٹانگا اودھیشا

روحِ عمارتِ مالوی جہاں فدا مالوی

گائے کے دم مر ڈیے پوجیہ پار مالوی

ہندوستان میں ہندو مالوی تو غیر ہندوؤں کے لیڈر تھے، انھوں نے
گاندھی جی کو بھی نہیں بخشا اور انھیں ساور کر کے صف میں کھڑا کر ڈالا:

دنیا میں جاتیں دو ہیں تو جی ہاک ساور کر گاندھی ہے

اک ظلم کا جلتا جھگڑا ہے ایک سکر کی چسپاتی آندھی ہے

آزادی کے متعلق ان کا تصور خالص قلمداد تھا ان کے نزدیک یکے کے
منش کی جگہ یا تو تخت پر تھی یا تختے پر:

ڈنیا میں ٹھکانے دو ہیں تو ملی آنا منش انسانوں کے

یا تخت مقام آزادی کا یا تخت مقام آزادی کا

ظاہر ہے کہ یہ تصور خالصہ جاگیر دارانہ دور کا ہے جب عام انسان

کسی کئی میں نہیں تھے، اقتدار کی جنگ تخت کے دو دعویداروں میں ہوتی

تھی جہاں سے جیتنے والے کو اقتدار کی مسند اور ہارنے والے کو تلوت

لٹا تھا، اس تصور میں جمہوریت یا حقوقِ ملی کی کسی عوامی تحریک کی کوئی گنجائش

نہیں چھرتی ہے کہ اس افتادِ ملیح کا آدمی تحصیلہ گوئی پر بھی آمادہ ہو یا غیر ملی

نے صرف غلام حیدر آؤ اور جو پہل ہی کے قیدی رہیں کہے بلکہ گھیر کے
سابق منگوائی ہمارا چہری سنگھ کا قصیدہ بھی لکھا ہے۔ یا کو یہ:

آنکھیں شیریں راگندہ رو بہ مزاج

احتیاج است احتیاج است احتیاج

والی بات تھی اور یہ کہ خوشے قلندر کی میں اپنا ذات پر احتساب اور غلبے
کی گنجائش ہی نہیں، ان کی کیفیات مزاج کو سب سے زیادہ ان کے سابق
معاوان اویغیہ کے حریف عبد المجید ساکت سمجھتے تھے، وہ ظفر علی خاں سے
سب سے پہلے برہمی نہیں سمجھتے تھے اور بالعموم طغیانیوں میں ہی شرفائیہ تھے:
ان دنوں سلطان میرزا اپنی قوم کو تجارت کی راہ پر گامزن کرانے کی
کوشش کر رہے تھے ظفر علی خاں نے اس سلسلے میں اسلامی بازار کا
منصوب بنایا تھا اور سنگ کے دوست احمد دزد کے مشہور اور بیاد تیار علی
چانچ ایک قلمی ادارہ قائم کرنے کی کوشش میں مصروف تھے ظفر علی خاں
کی طبیعت نے جو شہ مارا اور وہ قلمی ادارے کی مخالفت میں زور قلم دکھانے لگے:
اس سلسلے میں ان کی ایک نظم کا مندرجہ ذیل شروعاً غلطی میں درگیا ہے:

نئی ہند میں لے گا دزدے دے لاہور میں لے گا کر

اور اس کے فقری پتوں کی چوں میں جگائی لگی

اور مزعلی کو توشیح ہوئی تو مولائی کی مخالفت سے انھیں کاروباری نقصان
پہنچے گا۔ چنانچہ ساکت صاحب کی قیادت میں ایک وفد میرزا علی نوری سلطان
پر ملت برہی چند اختر بھی خاں تھے مولانا کی بارگاہ میں برابر اب ہوا اور انھیں

قائل کرنے کی کوشش کی کہ جب وہ خود جانتے ہیں کہ مسلمان تجارت کی طرف
مائل ہیں تو ایک سلطان کا رو باری ادارے کی مخالفت کیوں کر رہے
ہیں۔ مولانا کا ایک ہی جواب تھا کہ وہ مسلمانوں کو لاہور و لب میں جکڑانے کے
خلاف ہیں۔ وفد کے ایک ممبر نے دورانی گفتگو جب کہا کہ مولانا فلمیں تو
آپ بھی دیکھ لیتے ہیں تو انھوں نے عرض میں کہا کہ فلمیں دیکھنا اور بات ہے
اور جانا دوسری فلم دیکھنا تو معمولی بات ہے میں تو رنڈی کا لانا سننے کے لیے
بھی تیار ہوں لیکن رنڈی مسلمان نہیں ہوتی وہ جانا چاہیے۔ اس پر ساکت کی
رگ پرانے پھوکی جلتے نیاز مست دانا لہجے میں گویا ہوئے: مولانا یہ آپ کیا
غضب کر رہے ہیں، اسی کاروبار پر تو ہماری اجارہ دار کلبے کھلی بند رنڈی
نے سنبھال لیا تو ہمارے پاس کیا رہے گا:

سیاست کے متعلق بنجا بیوی کاروبار یہ تھا کہ:

ایک جنگلے پہ موقوف ہے گھر کی رونق

اور جگہ سارا دانی میں احتیاری سب سے آگے تھے۔ احتیاری جو خیر بھی
تھے اور غلطی بھی۔ چنانچہ مسلسل دن کا شیوہ تھا کہ میں یہ انھیں کبھی معلوم نہیں ہو گا
کہ اس چارواک مقصد کیا ہے، انھوں نے تار یا نول سے بھی لوہا لیا اور گھنیر
کے چہرہ پر سب سے بھی، اگرچہ وہ ان کے گھیر میں تھی اور یہ نیست پرانی
کے خلاف بھی وہ ہمہ وقت مصفا کارہے تھے۔ مسلم لیگ سے ان کی بھیج میں
بھی اور کانگرس کے ساتھ بھی ان کے جزوی اختلاف سمیٹ رہے۔ ان تمام

خاؤں و لچرہ ہیضہ بے مگر سے لٹے اور غریب بادشاہان کے جوش اور دوسے پر کسی اثر نادر نہیں تھا۔ لیکن مثبت طور پر یہ کیا جاتا ہے تھے اس کا علم بھی کسی کو نہیں ہو سکا۔ چودھری فضل حق مجلس احرار کا وارث کہلاتے تھے اور غالباً واحد احراری لیڈر تھے جنہیں پڑھے لکھے لوگ بھی قدس احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کی ہمت پر نظری علی خاں نے لکھا تھا:

دُر ہے یہ افتاد مگر ہی کو نہ بے بیچے کہیں
یعنی پیشینہ تھی دہوار فضل حق سے تھی

لیکن جب یہ ہفتہ روزہ نہیں تھا تب بھی احراری دہوار کچھ زبان ضیوہ انہیں بھی چودھری فضل حق نے کوشش ضرور کی کہ اس کی پیروی جو مجلس احرار کے اہم پرچار ہو چکی تھی، ایک منظم اور باقاعدہ پارٹی کی شکل سے دیکھیں۔ اس مقصد میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی، نہ ہو سکتی تھی۔ اس پارٹی کی عضویت کا سارا انحصار اپنے لیڈروں کے ذریعہ خطاب و عقائد ان میں سے ہر لیڈر پر چھتا تھا کہ وہ اپنی ذات سے خود نہیں ہے۔

احراری مقربوں میں سب سے زیادہ شہرت سے علیہ مدار اند شاہ بخاری کی تھی جنہیں احراری، میز شریعت کہتے تھے۔ خطابت میں انہیں دہری مقام حاصل تھا جو نظری علی خاں کو مصافحت میں، ایک بار ایسی پرکھڑے ہو جاتے تو بیٹھے کا نام نہیں لیتے تھے۔ تین چار گھنٹے تک تقریر کیے جاتا صرف یہی نہیں کہ ان کے لیے مشکل نہیں تھا بلکہ یہ ان کا معمول بھی تھا لیکن کیا جان کہ سننے والے آگاہ نہیں۔ جب بھی شاہ صاحب بیٹھے کا نام لیتے، ماضی کا احرار ہی ہونے کا تقریر جاری نہ ہے۔ ظاہر ہے کہ جو سرفرازی اپنی تقریر کرتے گاتے یہ کیا یا جسے کہ کا شروع کیا ان سے

کیا تھا اور غم کہاں کر لپے؟

اپنی خطابت کی شاہ صاحب کو داد و تحسین ملتی تھی لیکن یہ بات خود انہیں بھی معلوم تھی کہ ان کی تقریروں سے کوئی مثبت سیاسی مقصد پیدا نہیں ہوتا تھا کرتے تھے۔ یہ پنجابی گنگا مجیب ہیں، تقریر پوری سننے میرا دوش یونینڈ پارٹی کو دیتے ہیں اور تو کڑی انگریز کی لکھتے ہیں۔

سیاست میں دل چسپی رکھنے والے وہ نوجوان جو کچھ پڑھے لکھے تھے ان کو خود کو انشور سمجھتے تھے، شاہ صاحب سے نئی طرح باتاں تھیں، انہوں نے انتقاد شاہ صاحب کی تقریروں کے عجیب و غریب چرچے تیار کر رکھے تھے جنہیں وہ شاہ صاحب کا نام لے کر ایک دوسرے کو چالنے گھروں میں سناتے رہتے تھے۔ مثال کے طور پر یک شاہ صاحب نے اسلام آباد میں تقریر کر کے ہو کر کہا: اے یہ کہ اسلام آباد کا ہے جہاں سائنس بڑھاتی جاتی ہے، افسوس بڑھایا جاتا ہے، مسلمان بچوں کو صرف قرآن پڑھانا چاہیے۔ اپنی احراری لیڈروں کے متعلق بھی دانشمندانہ رویے، اسی قسم کے طعنے شہر کر رکھے تھے۔ لیکن اس سے بھی شدید تر مثلاً اعلیٰ کے، ایک احراری لیڈر کے متعلق مشہور تھا کہ اس نے برسر منہ کہا: لوگ مجھے بدعاش کہتے ہیں۔ ہاں میں بدعاش ہوں لیکن میں اللہ کا بدعاش ہوں۔

شورش کاشمیری کا آغاز و شباب انتہاء و یک وقت نظری علی خاں اور مدار اند شاہ بخاری کے نفوذی قدم پر چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ کوشش بدشکور نہیں رہی اور تقریر اور تقریر و دونوں انہوں نے کامیابی

سے کیے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ وہ اس پر کاندھ کر کے کو تیار نہیں تھے اور سیاست
 کے میدان میں کیا جھڑپے کا زور دیا جاتے تھے۔ جو شخص داور لوگے کی ان کے پاس
 کی نہیں کھتی تھیں۔ ہر سہ کے سیاست میں صرف کسی سے کام نہیں چلتا۔
 یہاں تھوڑی بہت کامیابی کے لیے کچھ فراست اور معاملہ فہمی کی ضرورت ہوتی
 ہے جس سے ان کا دامن خالی تھا۔ وہ ان شہزادوں میں سے تھے جو اپنے بار بار
 زخمی ہوتے۔ صرف یہی نہیں کہ انھوں نے قید و بند کی اختیالات برداشت کیں بلکہ
 اس کے دوران میں خصوصی تشدد کا شکار بھی ہوئے کیونکہ میل جاگروہ اس کے
 منہ بلیوں کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ ایک بار سات برس کی لڑکی کاٹ
 کر اپنے قہقہے سے کہنے لگے۔ جس نے وہ صحنے میں کتاب دو سونوں کو کھینچ مشور
 دیتے ہیں مجھے بھی مشورہ دیجئے۔ میں نے کہا: خود شصت صاحب آپ سیاست
 سے تو بہرہ کریں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میری بات انھیں ناگوار لگ رہی تھی لیکن
 مجھے آج تک یہ یقین ہے کہ ایک دوست کی حیثیت سے میں نے انھیں صحیح مشورہ
 دیا تھا۔ ان کے مزاج کا وہی سیاست میں ہمیشہ رہے گا۔

لیکن احرار کا ذکر طول اس لیے کر رہا ہوں کہ یہ جماعت نسبتاً زیادہ فعال
 تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسری سیاسی پارٹیوں کی حالت سے اس سے کچھ بہتر
 تھی۔ کانگریس کا دائرہ عمل سکر کو نہ فی پتھری چند دنوں تک محدود رہ گیا تھا
 اور شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ کانگریسوں کا زیادہ وقت اپنے جماعتی مخالفوں کی
 بجائے خود ایک دوسرے کے خلاف لڑنے میں بسر ہوتا تھا۔ پنجاب میں
 کانگریس کے دور دورے تھے۔ ایک کا نامانی ڈاکٹر سنیہ پال کر رہے تھے

اور دوسرے کی ڈاکٹر گوپی چند بھانگی۔ دماغی پر مشہور ہے کہ سیاست میں
 جو ڈاکٹر شریک ہوئے وہ یا تو بیوقوفیت تھے یا اپنے پیشے میں ناکام۔ لیکن
 یہ دونوں ڈاکٹر باقاعدہ ڈاکٹر کی پڑھتے تھے۔ وہ اپنے پیشے میں بھی بہت رکھتے
 تھے۔ ڈاکٹر سنیہ پال کے قہقہے بہت عرصہ گزرنے کا انھیں عیب ہے۔ جہاں تک
 جوش ملیں کا تعلق ہے ڈاکٹر سنیہ پال کو ڈاکٹر گوپی چند پر فوقیت۔ میں کبھی تو
 یہ کہہ سکتا ہے کہ انھیں بڑی خواہش تھی کہ انھیں کانگریس کے دامن میں داخل
 میں شامل تھے۔ ان میں سے بیشتر ضلع کے ساتھ تھے۔ مگر کانگریس پنجاب میں فعال
 جماعت ہوتی تو ہاں سنیہ ڈاکٹر سنیہ پال، ڈاکٹر بھانگی کو کچھ اور دینے نہیں کانگریس
 پنجاب میں تو ان جماعت میں بھی وراس سے کچھ بڑی بات یہ کہ جہاں ڈاکٹر
 سنیہ پال اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے تھے وہاں ڈاکٹر گوپی چند نے اس
 حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا۔ یہ کہ تو کہ کانگریس کا دائرہ عمل صرف پنجاب کے
 شہری چند دنوں تک محدود ہے۔ وہ ان کے ملے سم کے مخالفت کی تاہم کبھی
 کہہ دیتے تھے جو قوی مفاد کی کسوٹی پر پور نہیں اترتے تھے۔ مثال کے طور
 پر جب پارلیمنٹ حکومت کے کچھ ایسے قوانین پاس کرنا چاہے جو ہندوؤں اور
 کے حق میں تھے تو شہری جماعت پیشتر بیٹے نیا انھیں کالے قوانین کا نام لے کر
 کو ان کے خلاف سیاست اقدام شروع کیا۔ ہر شخص جانتا تھا کہ اس مسئلے میں
 شہری جماعت کو جو بیشتر ہندو تھے ڈاکٹر گوپی چند بھانگی کو کا مشورہ اور
 حمایت حاصل ہے۔ صرف کانگریس ہی نہیں بلکہ ایسے کئی لوگ بھی جو پنجاب
 کو سوشلسٹ اور کمیونسٹ کہتے تھے۔ اس کی مجلس میں گزشتہ میرے اور

میں طرح اس حقیقت کو خراب کرنا کہ سیاست کی اصول اور ضابطے کی
پابندی نہیں۔

ایک اور چیز جو ان دونوں کی نظائری میں فیصلہ کن ثابت ہوئی ہے یہ ہے کہ ڈاکٹر
گوپ چند ڈاکٹر ستیا پال کے مقصد میں کانگریس کے مرکزی لیڈروں کے زیادہ
طاقت مند تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ سر ڈیوڈ رینڈن ڈاکٹر ستیا پال کے یہاں
گئے تو ڈاکٹر گوپ چند ان سے ملنے گئے۔ یہاں اور رینڈن ان ایک صوفے پر بیٹھے
ہوئے تھے۔ ڈاکٹر ستیا پال گوپ چند سے بھی صوفے پر بیٹھا کہ ان کی گفتگو کی رو یہ کہہ کر
سر ڈیوڈ رینڈن کے قدموں میں بیٹھ گئے کہ میں تو یہیں ٹھیک ہوں۔

سوشلسٹ پارٹی کانگریس ہی کا ایک حصہ تھی اور کانگریس کو زیادہ بڑی
اور ترقی پسند بنانے میں مصروف تھی لیکن اپنا ہدف کے لیے اس کا زیادہ
تخصیص چونکہ کانگریسوں پر تھا اس لیے یہ کچھ زیادہ نمایاں نہیں ہونے پائی تھی۔
کیونٹ پارٹی ان دونوں پارٹیوں کے ہاتھ میں تھی۔ یہ مغرب و غیر مغرب کی
بقیات میں تھا اور اس کے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی، کچھ روپیہ تو وہ گردن قرار
سے اکٹھا کر لیتے تھے لیکن یہ عام طور پر مشہور تھا کہ کہیں کوئی دست غیب
بھی ہے۔ یہ لوگ بھی سوشلسٹ پارٹی کے قوسل سے کانگریس کے اندر بھی

سے کام کرتے تھے۔ زیادہ تر وہ دیہاتی سلیوں و رہنما ہیں جنہوں میں سے
بلیٹ فارم کام لیا کرتے تھے۔ وہاں وہ کچھ اس قسم کی تقریریں کرتے تھے
کہ بابا ایک ہندوستان کے پہلے کیونٹ تھے۔ ان کے مخالفوں کا کہنا
تھا کہ وہ اس قسم کے ہتھیاروں کے نواسے کے گرد ہر کچھ دیتے تھے جہاں یہ

ظاہر کیا جاتا تھا کہ کیونٹ پارٹی اسے بڑے اجتماع کرنے کی اہل ہے۔ ان
کے پاس اگر پیسے کی کمی نہیں تھی تو ان کے مخالفوں کے ذریعہ اس کا باعث بھی
تو ہوتا تھا۔

مسلم لیگ ان دونوں صرف ایک فرد مشترک تھی جس کا نام ملک برکت علی
تھا۔ جسے ڈاکٹر فاضل حسین نے ملوی بھی ان سے مل گئے۔ فاضل نے کہیں پارٹی
کا لاہور و اتنا مختصر دورہ لایا کہ خیال کرتے رہے کہ سوشلسٹ پارٹی
کیا کر سکتی تھی، ملک برکت علی کا سیلاب کہیں اور نہیں مارا۔ فارغ التحصیل تھے
تھے اور ان کے زمانہ میں سماجی بھی تھی۔ ڈاکٹر جلالی کا کہنا ہے کہ ایک
مرتبہ انھیں ڈرامہ کی ضرورت تھی، ڈاکٹر جلالی ایک ڈرامہ میں والے سلطان
کو بے ساتھ لے گئے اور اس کے اوصاف بتاتے وقت اس کی زبان نکلی
بھی تو کہہ کیا ملک صاحب کہنے لگے، ڈاکٹر صاحب آپ ٹھیک کہتے ہیں
لیکن اس کی وضاحت آپ کے قول کی تردید کر رہا ہے۔

ترقی پسند ادب کا غلط تصور میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے
نیز ایک ہندوستان پر ہوا تھا ۱۹۳۰ء میں کھنویں ہوئی تھی اس کی ایک وجہ یہ
بھی تھی کہ اس حال کے جو نیاز مند ہندوستان کے نام سے مشہور تھا ایک ستار
رنگین و غیر محدود تھا ترقی پسند ادب کی تحریک کے اہم رہنما میں سے
تھے۔ تحریک کا یہ مشہور حوالہ دے شائع ہوا اس پر تجاویز اور ان کے
بار بار دہرے رفقاء کے ساتھ تاثیر کے دستخط بھی تھے جو ان دنوں اعلیٰ

تقسیم کے لیے انگلستان میں گئے ہوئے تھے۔ منشی ربیع اللہ کے دستخط و کچھ کر
نیاز منہ لایا۔ پور کے ادنیٰ حصے کے کچھ پرانے دکن اور کچھ نئے وائس کننگھم
جو نیت نامہ کی دہائی ہزاری کاغذ و پندرہ گز کے ترقی پسند ادب کا کلچر تھے
لگے لگے تقریباً کے بلکہ آہستہ آہستہ چھوڑا جس میں ترقی پسند اسلام کے
ساتھ ساتھ ترقی پسندی کے مفکر بھی ہو گئے تھے۔ یہ وہی چراغِ حق تھی تھی
جس پر ہم بدھ و خدائے آستریائی سفر کے عنوان سے جو میں اپنی نظم لکھی۔

ترقی پسند مصنفین کی جانب سے ہر کافی مستحب تھے اور انھیں کیونست کچھ کر
حکومت ان کے دھپے آزار کچھ تھی تھی لیکن یہاں میں عجیب بات تھی کہ ترقی پسند
ادب کے سرگرم مالی مروجہ ہی نہیں کہ سرکار کے مستحب نہیں ہوئے بلکہ اس
ترکیز میں متباز ان کے دینی غرض کا باعث بنی گئی اور انھیں ترقی پسند مصنفین
کی سیکرٹری شپ کو تو سرکاری ملازمت کے حصول کا ذریعہ سمجھا جانے لگا۔ انھوں نے
پچھلے سیکرٹری سوسنا تھ چپ تھے جو انگلستان سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے
آئے تھے۔ سیکرٹری بننے کے لیے ان کی دن بعد انھیں بہت ہی سرکاری ملازمت
مل گئی ان کے جانشینیں کرشن چندر بنے جن کی دوستی کلمے شرف حاصل تھا
کچھ ہی مدت بعد وہ بھی انھوں میں آسوجھ کر تشریف لائے اور یہ دردناک خبر
سنائی گئی انھوں نے سرکاری ملازمت قبول کر لی ہے۔ باوجود ان کے اپنے الفاظ
میں خود کو فردِ نعت کو دیا ہے وہ غالباً اس مدد میں آئے تھے کہ میں ان سے اظہار
چند ہی کروں گا اور بہت کم ہوں گے کہ گالیوں کی بجائے لگوں لیکن جب میں نے
مبارکباد پیش کی تو انھیں یک گونہ صدمہ ہوا۔ وہ اپنے جذباتِ شہادت کی تسکین

چاہتے تھے میں نے اپنی حماقت سے انھیں اس لذت سے محروم کر دیا۔
کرشن چندر کچھ پرانے دکن اور کچھ نئے وائس کننگھم کے
اور چاہتے تھے کہ میں بھی سیٹھ کی زندگی بسر کروں اپنے لباس کے بارے میں وہ
کافی متاثر تھے اور پورے قلم کرنے اور انھیں نہانے کے آداب بھی انھیں لگے
تھے کچھ سے کٹ کر کہا کرتے تھے کہ کامیابی کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے:
اچھا لباس اور سنے کی معقول نگہ جہاں دوستوں کی ملاقات کی جا سکے۔ ان
دو باتوں کے سربزگ دلچ انداز تھے جن کی کچھ کتابیں یورپ میں چپ کی تھیں
ایک بار وہ کہتے تو میں کہہ کرشن چندر اور نریندر ناتھ سیٹھ ان کے لئے
سوسنا تھ چپ کی کوٹھی پر گئے۔ ملاقات کا وقت کرشن چندر نے بھائی کی انتظار
لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو وہ کوٹھی پر ملک دلچ انداز تھے اور دماغِ صاحبِ خانہ
ہم جنہوں انتظار کرتے رہے اور وہ کلنا دیں لہو آئے۔ اس دوران میں کلمے اور
نریندر ناتھ نے کئی بار کرشن چندر سے جو خوشگئی کا بی ہم ہو رہے تھے، کہا کہ
ہم انہیں انتظار کر رہے لیکن کرشن چندر نے ہمیں روکے ہی رکھا۔

کشمیراں کو کرشن چندر کا کلچر مانا اڑا کرتے تھے کہ کیونست
ہونے کا بی ہے لیکن جو کچھ استعمال کرتا ہے اس پر پورے دھنکے ہوتا ہے۔
ایک اعتبار سے یہ زیادتی بھی تھی کیونکہ کرشن چندر ان دونوں پر فرائز زندگی بگڑنا
بستر نہیں کرتے تھے اور ان کا قیام ہندو ہوسٹل میں تھا جس میں کچھ استقامت

۱۱) ہمیں دفن ڈرائے لکھا کرتے تھے یا کلچر سرکاری ملازمت میں ہیں۔

کے لوگ ہی رہتے تھے اور اچھا لباس بھی وہ غائبانہ دلوں نے اٹھاس کو چھپانے
یا اپنے لیے ترقی کی راہیں نکالنے کے لیے ہی استعمال کرتے تھے۔

فریبنڈ نامہ سیر کو کرشن چندر کافی مستل کرتے تھے اور اس کا طریقہ انھوں
نے یہ ڈھونڈا تھا کہ اسے اپنی پھر باعقول کو کیا بیوں کے قصے جن میں جنسی نتوہات
بھی شامل تھیں سنانے پر مہم میں سیر کو بار بار کھاتا کہ وہ ان دیوانہ لائی قصوں
سے اتنا مرعوب اور افسردہ خاطر نہ ہو لیکن اس پر سبب یہ ان کا وارنٹ ہی جاتا تھا۔
ایک دن کرشن چندر نے بتا لیا کہ اس پر ایک اور وارنٹ دی ہے۔ ان کی خاوی
ہند کی کئی جوان کے وارنٹ نے طے کی تھی کہ اس پر کرشن چندر کے چہرے پر واقعی
نور شباب و ہنس رہا تھا لیکن میری شقاوت تیلی نے اس پر بھی مجھے اظہار ہمدردی
سے باز رکھا لیکن میرا اسے تسلی دینے لگا کہ جب ترکیب کا قند ستودہ ظہیر مادی میں
شادی کر سکتا ہے تو اسے اس معاملے میں اپنے ماں باپ کی اطاعت سے انکار
کیوں ہو؟

کھنڈیا لال کپور کا کوئی مسئلہ تھا ہی نہیں، وہ ڈی۔ اے۔ وی کالج میں انگریزی
کے استاد تھے اور اپنی خواہ کے علاوہ کچھ روپیہ وہ لکڑی کی کھپیاں کھڑکی کی کسا
بیٹے تھے۔ انگریزی کا سب سے زیادہ شہرہ دارین طالب علم تھے جب بھی ان سے
بات ہوتی ان کی کیفیت کا فائنس ہوتا ہے لیکن کچھ وہ دیکھتے تھے وہیں کے اپنے فائنس
کردہ سیر کے مقابلے میں بہت حقیر ہوتا اور اپنے دوست و بیوں کی عکازات پر اپنا جھڑپ
کرتے ہوئے بھی وہ اپنے مقصدی میاؤں کو اکثر سبیل جاتے تھے میں نے ایک ایسے تضاد
کا ظرف ان کی توجہ دانی تو انھوں نے چاہی میں صرف اتنا کہ سب ملتا ہے۔

سب ملتا ہے یہ ایک ایسا کلیہ ہے جو اسم عظم کا حکم رکھتی ہے اس کی
مدد سے اس دور کی ادبی سیاست کا ہر نقطہ داہر جاتاہے نظر توں راہیں گویا
دوستیوں بلکہ برقدار کجیشت ان دنوں اتنی تھی کہ وہ مذہب کا مسئلہ لگ بھگ
کی سیر جہاں تھیں اس ذہنیت کے ساتھ آدھوں کی دہائی میں کے بے ڈرے
ہکا دل کرنے کی ضرورت تھی۔

ترقی پسندوں کا اپنی خوش ہوتی تھی لیکن اس کا کوئی واضح مفہوم نہیں ہوتا
کے ذہن میں نہیں تھا ترقی پسند شخصیں کو بجا جرحہ کھا گیا وہ سب کے نام سے شانت
ہوتا تھا۔ خواہ سب ایک ایسا پرچم تھا جس کے جھنڈے تلے سمجھا دیا سب کو کسی کسی
پہلو سے جدت پسندی کا ثبوت دیا یا جدت پسندی کے ٹکڑے ہوں، جمع ہو سکتے
تھے۔ لیکن ترقی پسندوں کے ذہنوں کو جو عکاس کا اثر اس سے رہا تھا اس
لیے اس کا سب سے پہلا اثر تھا جو یہ کہ اس کی کوئی بات نہیں تھی ترقی پسند
تھی ان اور صدارت حسن متشاور کو اپنی صف کا وہی قرار دیتے تھے۔ اس کی
ایک وجہ غالباً یہ تھی کہ ترقی پسندی ان دنوں دنیا کا شہرہ ہر جہے اور نئے نئے خطے
خواہ مغربی یا پسند چڑیا انہیں اس طرح سے کہ حصول شہرت کا ذریعہ سمجھتے تھے۔
فرانکلیٹ اور اس کی سبب کا اب بھی نقد و بہت جدت پسندی پسندوں کی کج فہمی آیا۔
ان دنوں ان دنوں کے ڈاٹسے ملے ہوئے تھے۔ ترقی پسندی کے بارے میں
ان دنوں کتنا اب اس مقام اس کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ چند ناخدا شکست
کے نزدیک ترقی کا مطلب یہ تھا کہ وہ کامیاب ترقی ان دنوں کا رہا جائیگی۔

کرشن چندر اور اچندرا تھا شکت کوہا ماسحات کا طعن بھی کتاب ادب کے
 میدان میں لکھری کا دوسرے نمبر پر دوسرے لکھری کے پکس کا جوابی تھے اور ادبی کا
 کلا دیا نہیں کیا کہ اگر تھے یہ دونوں اصولی کامیابی کے واضح پتہ و گم کے تحت
 ہر قدم ناپ تول کر اٹھتے تھے کرشن چندر اس معاملے میں زیادہ ذریعہ تھے دوسرے
 جہ سے کے دیکھنا ہی نہ تھا کہ کسی نئے میلے سے اپنے حق میں کچھ لکھنا
 جب ان کی کوئی تحریر پہنچا شائع ہوتی تو وہ اپنے دوستوں سے کہتے کہ وہ اس کی
 تعریف میں دیکھو غلط نہیں ادب لطیف کا اور اس دن دونوں بڑا ادیب کے پیر
 تھے جو جسے ہی شریف اور عظیم صورت کو لگتے تھے اور ان کی خرافات سے فائدہ
 اٹھا کر دوست کھڑاں کا زبان بکھڑا کر دیتے تھے ایک بار وہ میں کرشن چندر
 اور مرحوم چودھری بہکت علی ادب لطیف کے دفتر میں بیٹھے تھے صبراً اور دے کے
 خطوط سنا کر ان پر تین چھپے دیکھ کر اس کے ڈسٹ کوہ کا ڈیرا بن کر پانچا
 جس پر کرٹھ نے ایک پس کی تصویر بنائی تھی چودھری صاحب نے فریادیں
 دیکھا تو میری دیکھ کر انت کھڑکی اور میں نے میرزا ادیب سے مخاطب ہو کر کہا
 "بھئی میرزا اور میں تو خوب ہے لیکن کرٹھ نے تمہاری تصویر پر ٹھیک نہیں بنائی
 میرزا ادیب قدرتی طور پر برہم ہوئے لیکن چودھری بہکت علی اور کرشن چندر کے
 رویے میں نمایاں فرق تھا جہاں چودھری بہکت علی نے میرے فقرے کو لطیف کہہ
 کر اس سے تکلف لیا وہاں کرشن چندر نے اس کو غصہ سے فائدہ اٹھا کر میرزا
 ادیب کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی میرزا ادیب نے میری زیادتی کا
 انتقام لیا کہ ہم اسلم کو میرے خلاف بھڑکا دیا کہ میں جہاں جیتتا ہوں ان کے

خلاف فقرے بازی کرتا ہوں اسلم صاحب نے اس کی شکایت مولانا اختر سے کی
 تو انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے ایم اسلم سے کیا کہ ہے؟ میری ایم اسلم سے نہ
 اس وقت تک ملاقات ہوئی تھی نہ اس کے بعد پوری اس لیے کہ اس سال بھی پیدا
 نہیں ہوا تھا میرے انکار پر مولانا نے غور و نامہ کیا ایم اسلم مجھ سے بات پہنچاؤ تو
 لیکن وہ لوگ گفت گو کر کے خبر کا پتہ چل چکا تھا اس لیے میں نے اسے اس کتاب
 نہیں کہا میں پہلے ہی میرزا سے زیادتی کر چکا تھا انھیں جھوٹا ثابت کر کے مزید
 زیادتی کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

عظیم نیاز سنا ہوا بھور کے لاکھیں جو پنجاب کی ادبی زندگی میں اب کافی
 مؤثر تھے کرشن چندر کی دوستی کا ہدف خصوصی تھے اور ادبی دنیا کے مدیر
 صلاح الدین احمد کے دربار میں تو وہ روزانہ حاضر رہتے تھے مولانا کی بھلائی
 پر خصوصی غور و نظر لگتی تھی یاد نہیں ہے تاکہ ادبی دنیا میں ان کا کوئی انسانہ شائع
 ہوا ہو اور مولانا نے اس پر طویل تقریریں نوٹ کا اضافہ کر دیا ہوتا تھا کہ اس کے لیے
 انسان دیتے وقت مجھ سے بھی انھوں نے یہ کہا تھا کہ میں اس پر ایک تقریریں نوٹ
 دے دوں اور ان کا یہ مطالبہ میں نے خوشی پر کر دیا تھا ان دنوں کرشن چندر
 افسانے لکھی اچھے سمجھتے تھے فادر مولانا افسانے لکھنا انھوں نے بعد میں غرض کیا۔
 سیاست میں پہلی قدم کرشن چندر نے کمیونسٹ پارٹی کے خلاف اٹھایا
 تھا بھور میں انھوں ان کے ایک خبر دوست حلقے میں یہ دنوں ایم ایم داس کے
 خیالات مقبول ہو رہے تھے ان خیالات کے ادبی منہا میرزا نے نہ تھے جو اسکو
 کے قربیت یا نہ کیونٹ تھے وہ قریب کبیر کے وہاں میں دس گئے تھے

اس لیے دوسرے مہاجرین کی طرح ان کے گھر بھی ایک دو انوی سا ہل رہا ہو گیا تھا۔ اور انہیں اپنے گھر کے کاغذی نوچ بھائی تھا۔ وہ کاسٹرن کے سپرد چکے تھے جو پاپ کی متعدد کمپنٹس پارٹوں میں انھیں راہنما دیتا تھا۔ ماسٹن تھا اور چین کی انقلابی تحریک کی باگ ڈور بھی کچھ دن انھیں کے ہاتھ میں رہی تھی جن لوگوں نے ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ پر بھی ہے وہ بھی جانتے ہیں کہ یہاں کی تحریک کا شریعتاً شرف میں باہر سے ترقی چلتے رہے۔ ان کی یہ شہرت بھی محکمہ کٹ میں انھوں نے نہیں دیکھ سکتے کہ وہ کیا تھا اور جو وہاں نظر اس سے منہ بھی نہ تھا۔ بیکر پارٹی کے دور میں وہ معروف قرار پائے تھے اور کاسٹرن سے بھل رہے گئے تھے۔

محمد رفیع کو سماجی فضا میں اور نہیں لگی کرشن چندر، مزید ناتھ، سیٹھا اور میرا سب اس بار وہ میں شامل ہو گئے۔

ہولوگ کی پوسٹوں کا اس بات پر مذاق اڑاتے تھے کہ وہ بات بات پر باکس اور ٹینوں کا حوالہ دیتے ہیں اور اپنے ذہن سے کام لینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اپنے مزید سامتی پیدا کرنے کے لیے ہم نے پیپلز کلب کے نام سے ایک کلب قائم کیا تھا۔ اس کی دادر سرگرمی یہ تھی کہ وہاں دن رات سب سے اچھے بھائی ہوتی تھیں۔ ایک دو ٹریڈ یونین بھی تھیں۔ بناؤ انھیں کہش چندر ان سب سرگرمیوں میں شریک تھے۔ بیکر کھل کر بات کرنے سے وہ اکثر پہلو بچاتے تھے۔ کئی فٹنل سے ان کا میل جول، اندر نہ شریعت ہوا۔ اس ماضی کے واقعات پر نظر ڈالنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سب کچھ انھوں نے سوچا بھی اس کے تحت کیا تھا۔ اگر وہ خزانہ ہیں کمیونسٹ پارٹی سے جانتے تو شاید ان کی اتنی بے پروائی نہ ہوئی۔

وہ محدود بناوٹ کی مادہ پرستی کر لیتی تھی۔ قدرت و حمت پر ایمان نہ ہوتے تھے۔ میرا بھی کیا یہ عالم تھا کہ:

نرالی وضع ہے، سارے زمانے سے نالے ہیں

یہ عاشق کو کتنی بستی کے یارب رہنے والے ہیں

ایک لڑائیوں نے اپنی ہیئت کرائی ہی مجھ کو ناچار کچھ بھائی اس نظمیں وہاں ہی لکھتے تھے جو بعد دس چند لوگوں کی سمجھ میں آ سکتی تھیں۔ ان کے لیے بڑا کو نظر آتی تھی۔ وقت وہ خط لکھتے تو اس پر یہ ضرور لکھ دیتے: "یہ خطبہ نظم نہیں خیر ہے کہ ان کی نظم متقی پڑ چکی ہوئی تھی۔ ان ہی بات کی شریعتاً وہ دلی دنیا میں اس کے وہ نائب رہے تھے۔ انھوں نے مختلف برہمنی اور شاعروں پر جو مضمون لکھے انھیں مولوی سوجوہ چور کئے۔ وہ انھیں بھی سمجھ سکتا تھا۔ ان سے ان کے ذہنی بلوغ کا بھی پتہ چلتا تھا اور ان کی وسعت معلومات کا بھی۔ ان کے گورو اچھا لکھنے والے شاعروں کا ایک باقاعدہ حلقہ پیدا ہو گیا تھا جو نظم میں ان کا تعلق کرتے تھے۔ انہی لوگوں نے ان کی مادہ خانی میں حلقہ اسباب ذوق کی بنیاد رکھی تھی۔ ان لوگوں انھیں ترقی پسند متفق تھے۔ ان کا حلیف نہیں سمجھتے تھے اور ترقی پسند وہ اس کے ممبروں میں شریک ہوتے تھے۔ حلقے کے سادہ خاندانہ و خال ترقی پسندوں کو بہت دن بعد نظر آئے۔ جب انھوں نے میرا بھی کے خلاف باقاعدہ جہاد شریعت کیا۔

میں میرا ہی کی شاعری کا مزاج تھا۔ ان کی تحریروں کو بڑے شوق سے پڑھتا تھا اور جو لوگ ان کی نظمیں کو مہل بتاتے تھے ان سے جھٹکا بھی تھا۔

لیکن ذاتی مسلح پر بیان کے ساتھ تعلق یہی علیک سلیک کے کھمبے آگے نہیں بلکہ
گزرتی میری طرف ہی سے تھا ان کی شاعری کا انداز ہونے کے باوجود ان کے
سرکات کو برداشت کرنے کی تاب نہیں نہیں تھی ان کے متعلق لوگوں نے
محبت و طرب تھے مشہور کر کے تھے نہیں میں کہ یہ گمان گزرتا تھا کہ وہ
خاتمہ مستقل ہی نہیں بلکہ ایک خطر تک آؤں گی میں نے ان قصوں کی سمیت باجماعت
کے جلسوں میں نے کبھی جھانپا نہیں کی کہ یہ گزرتا تھا کہ اس شخص کی
راہی تھی اس کی رشتہ ہو جو گزرتا تھا کہ وہ در کوٹ پہنچا ہوا کہ سی
پراگروں میں تھا ہوا وہ گزرتا تھا کہ وہ گزرتا تھا کہ وہ گزرتا تھا کہ وہ
آئی تھی ذاب آتا ہے کہ شاعر کے داخلی انتشار کا مظاہرہ اس کے خارجی مظاہرہ
میں کیوں ضروری ہے؟

جو فوجان شاعری میں میراثی کی تقلید کرنے کی کوشش کر رہے تھے یا
ان کے قریح خصوصاً تھے وہ بھی میراثی کا کافی کے معاملے میں ان کی جبروتی کی
کوشش نہیں کرتے تھے۔ قیوم نظر سرکاری ملازم تھے اور یوسف ظفر نمایاں
بشیر احمد کے ہمراہوں کے نائب مدیر تھے یہ دونوں ہی معقول صورت آدمی
تھے اور ان کے طور طریقے بھی عام آدمیوں سے مختلف نہیں تھے۔

میراثی کے ایک شاگرد مبارک احمد سے میں نے متعلق مشہور تھا کہ
وہ اطوار میں بھی میراثی کے معنوی ہیئت مشابہت رکھتے ہیں تقسیم سے چند ہی
ماہ قبل میری ملاقات ہوئی ان میں نے "ادب لطیف" کی ادارت سنبھالی تھی کہ وہ
ان کا ایک نظم لے کر پہنچ گئے میں نے نظم کو سرسری سے پڑھیں کہا کہ نظم

جھپ جھپ کے لکھنے ان کے جبر سے بوجہ لفظی کے آثار تھے جیسے وہ کہتے
ہوں کہ میں انھیں طراز ہوں۔ میں نے وہ نظم خائن ہی نہیں کی بلکہ خنار سے کی
اسی نظم سے کی نظم و حکم وہ پھرتے میں کھاسا شکر یاد کرنے آئے میں
لیکن یہ بات میں تھی ان کے خیال میں میں نے ان کی نظم کے غیر ہی شائع کر دی
تھی اگر کچھ لیتا تھا تو ہرگز شائع نہ کرتا کیونکہ اپنے مفہوم کے لحاظ سے یہ
بڑی ہی قابل اعتراض تھی اس نظم کو لے کر وہ میرے کئی پیشروں کے
پاس آئے تھے اور سب نے اسے خطرناک اور ناقابل شاعت سمجھ کر واپس
تھا لیا ہے کہ اگر میں نے اسے شائع کر دیا تھا تو اس میں میری بے کھمبے ہی کو
داخل ہو سکتا تھا۔

میں نے کہا مبارک احمد صاحب اس نظم کو میں تو سمجھ گیا ہوں لیکن غالباً
اپنی نظم کا مفہوم پورے طور پر خود آپ نہیں سمجھتے اور میرے پیشروں نے
بھی غالباً اسے سزا دے کر آپ کو اس مفہوم کا بغیر دلیل از وقت بتا دیتے
ہوں گے آپ کی دانست میں اس نظم کا موضوع استغناء یا العیب یا اور بہت
حکس ہے کہ جب آپ نظم لکھنے بیٹھے ہوں تو آپ کی نظم کا نقطہ آغاز واقعہ
ہی ہو لیکن تخلیق عمل کی گرفت میں آکر آپ کہیں سے کہیں پہنچ گئے اور جب
یہ نظم مکمل ہوئی تو آپ نے موضوع سے بہت اونچا اور عجیب طرز کی تھی۔

میراثی کو ان کھنوں میں مبتلا تھے اس کا ثبوت خود ان کی نظموں میں ملتا
ہے اور اتنی بھی شاعری یا کارانہ نہیں ہو سکتی لیکن اپنی خورانی کیفیات کا
اظہار جب وہ اپنے ظاہری اطوار میں بھی کرتے تھے تو بہت ممکن ہے کہ اس

میں خود راہبیت اور وہ بھی مثال ہو۔ دوسروں کے تو یہ چند طرف منہ دل کرنے کے لیے لوگ کیا کچھ نہیں کرتے؟ یا کچھ ممکن ہے کہ جن لوگوں کا انھوں نے خاص طور پر معاملہ کیا وہ چونکہ خیردانی تھے اس لیے ان کے طور طریقوں کو غیر شعوری طور پر انھوں نے بھی اپنا ہیو مولوی عمر حسین آغاؤ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ جنوں کے عالم میں بعد از وہی حرکات کیا کرتے تھے جن کا ذکر انھوں نے آپ حیات میں مسیّد اقبال کے حالات کے بیان میں کیا تھا۔

دوسری بات کے قاتلے تک پنجاب کی سیاست میں پورنیت پارٹی کا یوں یا اس پر یہ ایک علاقائی پارٹی تھی اور اس کا طریق کار کاغذات میں سے تھوڑا موثر تھا نہیں اور بلکہ بانگ و عادی سے اسے کوئی ملاقات نہیں تھی اور اس کا مقصد انجینی سرور کے اندر کاروبار محکومت کو چھاننا تھا۔ انجینروں کی طور پر یہ پارٹی دیکھ حقوق کی ترجمان تھی اور انتخابات بھی یہ نہ بد و نہ بد ہی حلقوں میں سے لڑتی تھی۔ مسلم زمینداروں کی اگرچہ اس میں گھڑت تھی لیکن اس کا یہ دیگر گھڑت اور مادہ نہیں تھا۔ ہریانہ میں اس پارٹی کی قیادت سر جیہ لورام اور اس علاقے کے دوسرے جاٹ کرتے تھے اور سر جیہ لورام کے متعلق کچھ جانتے ہیں کہ وہ ہریانہ سر جی تھے۔ ہر چند کہ وہی جنھوں سے اس پارٹی کے تھے خاندان سے متعلق ہر گز جانتے تھے کہ وہ صوبے میں بلا شرکت غیرت اپنی وزارت بنا سکتی تھی لیکن اس نے بعینہً غلط وزارت کو ترجیح دی کہ وہ سپریمری ہندوؤں کو وزارت میں شریک کرنا شہر کی ہندوؤں کے اتحاد سے عام طور پر ہندو مسجد کے محفل پر انتخاب لڑنا

تھے۔ اس کی کے اندر اور باہر یہ پورنیت پارٹی کی کہریات نوادی پر بنا برقرار تھے کرتے تھے اور اس پر ہندو دشمنی کا لازم بھی لگاتے رہتے تھے جس سے سب سے زیادہ بڑھا سر جیہ لورام کو بدی تھی لیکن کانڈہ و دیگر حکومت میں پورنیت پارٹی کے ہمیشہ حریف بنے۔ سب سے ان ہندوؤں کی شخصیتیں ایسی ہرگز نہیں تھیں کہ کوئی ان پر حسد انوں کا دیکھتا ہوئے کا لازم لگا سکے۔ ان میں مادہ زمیندار تھا بھی تھے، ڈاکٹر سر جیہ لورام چند سنگھی اور سرور لال بھی۔

اپنی داخلی تنظیم میں بھی پورنیت پارٹی ان کی خاص خاصا اہم پرستی میں جھکا تھا۔ اگر کسی نشست کے لیے نہ مادہ زمیندار ہو یا نہ جیسے لورنیت پارٹی دونوں ہی کو انتخاب لڑنے کی اجازت تھی۔ دیکھ دیکھ دو تو اس پارٹی کے امیدوار کی حیثیت سے ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے اور جگہ جگہ جیتا وہ پورنیت پارٹی کے رکن کی حیثیت سے سبکی میں جا بیٹھا۔

مجاہدوں و کت کے انتخاب کو بھیڑ کو قہر یا کبھی انہیں اپنے ذاتی منکام سے اس کا حق نفرت کرتے رہتے تھے۔ پورنیت پارٹی نے یہ راستہ اختیار کیا کہ دوسرے پنجاب میں یا مگر سب کے باؤں جینے دیے تھے۔ یہ مسلم لوگ کے۔ لیکن اس کا اپنا نہ کوئی خاص تنظیمی نظام تھا نہ پلیٹ فارم۔ ہر بات کا اتحاد نہ لڑائی مسلح کے قہر جڑ پر تھا۔ پنجاب کا، محل اس کے لیے سازگار تھا۔ اقتصاد کی طور پر یا جو بہ ترقی پذیر تھا جس سے طبقہ متوسط کی خوشحالی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کسانوں میں زیادہ تعداد زمین مالکوں کی تھی اور فوج اور مرکزی حکومت کے دوسرے شعبوں میں بھی بچاؤوں کو اپنے تناسب سے کچھ زیادہ کی حاکمیتیں حاصل تھیں۔

ہندوستان کی جڑ میں تو گہری جہنم کی کوئی بھی قسم کی عوامی جدوجہد
 شروع نہ ہو سکتی۔ جو نیشنل پارٹی کی خلاف پارٹیوں کو اپنی گری بازاری کا نام کہنے
 کے لیے ہر وقت کوئی مذکورہ جتن کر دیا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ نیشنل پارٹی
 کی بڑے اصولی اور اپنی پاصولی کے متاثرہ حامی کے باوجود ان کے لیے کسی بھی اصولی
 پرستار مسک کو اختیار کے رہا ممکن نہیں تھا۔

مولانا ظفر علی خاں کی تبلیغی پارٹی بھی اس لیے اصولی اور جنگاوی سیاست
 کی پروردہ نہ ہو سکتی جو انھوں نے سوشلسٹ پیگ کی وارڈاری کے لیے قائم کی تھی۔ اس
 کی بدولت مولانا ظفر علی خاں کی گروم پارٹی بھی ہوئی اور اس کے لیے کچھ مخصوص
 مسئلوں کی جائز بھی کی گئیں کسی سیاسی کامیابی سے بغیر جس کا طرح سے پارٹی
 کا وہ بھی خالی رہا۔ ۱۹۳۷ء میں مولانا ظفر علی خاں نے اس پارٹی کے ٹکٹ پر کراچی
 اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ عام حالات میں کانگریس شاہین کے مقابلے میں کوئی امیدوار
 کھڑا نہ کرتی لیکن میاں محمد ابراہیم جو ۱۹۳۷ء میں کانگریس کے ٹکٹ پر انتخاب
 جیت کر کانگریس میں اقتدار اور دھرم و عین کی کنٹرولیں مار رہے تھے، اپنا لواحقین
 چاہتے تھے۔ انھوں نے کانگریس پارٹی کی موافقت سے مولانا کے مقابلے میں ایک
 مسلمان مسلم و دھرم و عین کو کوٹھڑا لگا کر جڑ سے اڑا دیا تھا۔ وہ اپنے
 خیال پر تھا کہ برادری اور پیسے کے ذریعہ اگر اس سے مولانا کو شکست نہ بھی دی تو کم
 سے کم ان کا کامیابی سے متاثرہ افراد کو سکے گا لیکن بہت جلد ثابت ہو گیا کہ انتخاب
 میں عوامی بہت کامیابی حاصل کرنا تو ان کا کانگریس کے لیے مسئلوں کے خلاف میں اپنی
 انتخابی مہم چلا بھی اس میں نہیں مولانا ظفر علی خاں کی انتخابی مہم میں ایک صاحب

فیروز زالدی کا لڑا اور شہید تھے جو انتخابی جلسوں میں اس قسم کی تقریریں کیا کرتے تھے۔
 "اے عبدالعزیز اے کانگریس کی کنیز اے تو میں کی چیز"

ظاہر ہے کہ اس قسم کے ماحول میں کسی نظریاتی یا اصولی بحث کی کیا گنجش
 تھی پکی پختوں نے دہشت کا پورا ماحول قائم کر دیا تھا۔ کانگریس کے جیو بیٹروں
 کے متعلق انھیں مستحق تھے مگر انھوں نے عبدالعزیز کو مولانا کے مقابلے پر کھڑے ہونے
 کی شدہ دیکھ کر ان کے گھروں کے سامنے انھوں نے مظاہرے بھی کیے اور ان کے
 سیدہ وال کی کوٹھی کے سامنے مظاہرے کیاں بھی شاہ جہاں کو کوٹھی نسبت روڑ پر
 تھی جو قریب قریب ہندو ملاتہ تھا مولانا کے حامی ڈاکٹر صاحب کو گفتنی یا گفتنی
 جتان کے لیے میں آیا کہتے رہے۔ مذکورہ کو کوٹھی سے باہر نکلا اور نہ کسی نے جوابی نفرو
 لگا یا مظاہرے بھی وہیں گئے جب وہ جڑ بولگ چاہتے تھے کہ
 کانگریس میں نے اپنی بے بسی کا لڑا کر کے کے لیے عوامی مہم سے مرعوب ہو جاتے
 اور ہاتھ نہیں تھکا دینی پختوں کی کڑواہٹ کے مقابلے میں ڈٹ جاتے تھے جہاں
 وقت تک کانگریس کا دھرم و عین اور عزیمت ہر پکی اقدامات سے دست برداری
 کے لیے اس نے ایک عجیب ڈاکٹر کیا۔ اخبارات میں خبر شائع ہوئی کہ عبدالعزیز
 اور مولانا ظفر علی خاں کے حامی ایک جگہ جمع ہوئے اور انھوں نے جہاں بھی آئیں
 کو روکنے کے لیے بے گناہ کی انتخاب کا فیصلہ و دلائل کی بجائے قروندہ انداز سے
 کر لیا جائے۔ قروندہ انداز کی گئی اور ہاتھ نے فیصلہ مولانا ظفر علی خاں کے حق میں
 دے دیا۔

ظاہر ہے کہ کوئی بھی شخص اس دہشت گردی میں نہیں کردہ تھا کانگریس

کی یہ ہر حال شکست تھی جس کا اس کے مستقبل پر گہرا اثر پڑا۔ پنجاب کے مسلمانوں میں
کاگرس کو مقبولیت پہلے بھی کچھ زیادہ حاصل نہیں تھی۔ اس کے بعد وہ سہا بہرم
بھی جاتا رہا۔

اگرچہ اس وقت صرف سیکرٹریزم کا یہ اثر پنجاب میں کاگرس کے قدرتی حلیف
یونیٹس تھے لیکن یونیٹس پارٹس کاگرس کو جیسے وہ ایک برطانوی نواز
پارٹی سمجھتی تھی، باقی اقوال میں اختلاف تھا۔ ویسے بھی اقتدار کے معاملے میں اس
کی حقیقی حریف یونیٹس پارٹی ہی تھی چنانچہ اسے شکست دینے کے لیے
کاگرس احراریوں اور سابق احراریوں کی حیدری پارٹیوں کی حمایت کرتی
رہی اور معاملہ سلجھنے کی بجائے الجھتا رہا۔ یونیٹس پارٹی اور بددیہی مسلم لیگ
کے لیے شکست پیدا کرنے کے لیے احراریوں نے ہر قسم کے سہارا دیا۔ اسے اندر
تکلیف انہما خیرے اور اکیس ایک غرض و حکومت نے بھی تھا۔ اس لیے کہ بددیہ
سیکولرزم کی اس ضد تھا لیکن اس قسم کے غرضے لگانے والوں نے حیدری پارٹی پر ہر جگہ کاگرس
انہما خیرے اور اکیس ایک لٹے کی بجائے دیرپہ اور اپنا حلیف سمجھتی ہے۔

لیکن قوم پرست مسلمان سیاسی کارکنوں کا گرگس کے ساتھ ضرور تھے
اور ان کا کوئی دشمن بھی نہیں تھا۔ کہہ سکتے ہیں کہ کاگرس سے ان کی وابستگی کا باعث
عقیدے کے سوا کچھ اور بھی تھا۔ لیکن جہاں تک مسلم عوام کا تعلق ہے، ان میں
کاگرس کی مقبولیت ختم ہوئی جا رہی تھی۔ کچھ مسلمان کاگرس کی قوم پرستی میں اتنے
فانی تھے کہ جب تک تقسیم ہوا تو صرف ہندوؤں ہی نے مغربی پنجاب سے ہجرت
نہیں کی بلکہ وہ بھی ان کے ساتھ چلے آئے۔ مثلاً ضیہ افضل دین اور خان غازی

کا جی لیکن ظاہر ہے کہ بعد و سے چند لوگ خواہ کتنے ہی تخلص کیوں نہ ہوں،
ایک دھڑے کا شمع نہیں مٹا سکتے تھے۔

میاں افتخار الدین اور ان کے کچھ ساتھیوں کا خیال تھا کہ خدا کی رحمت
کو چھوڑ کر کاگرس مسلمانوں میں مقبولیت حاصل کر سکتی ہے لیکن یہ نسخہ کارگر
یوں نہیں ہوتا تھا کہ شہزادوں کو پیچھے رکھ کر جہاں تجارت زیادہ تر ہندوؤں کے
ہاتھ میں تھی، پنجاب کے مسلمان عواموں کا گروہ ہرگز نہیں تھے۔ پھر جیسا کہ
میں ایک بار پہلے ذکر کر چکا ہوں پنجاب کی کاگرس کی ایسا بھی نہیںوں کی
حمایت بھی کر جاتی تھی جو خالص تجارت پیشہ طبقے کی حمایت میں چلائے جاتے
تھے۔ سو ختم کی بات اگر انہی نے میرا بھی جانی تو اس سے درباری مسلمانوں کی
برہم کی کا اسکاں تھا جن میں سے بیشتر زمین کے ایک تھے چنانچہ سابق احراری
اور ان کے دوسرے برہم کی ساتھیوں کا موقف سیاسی کارکنوں کی بھی مجلسوں
میں تو موضوع گفت گو تھا لیکن بات اس سے آگے نہیں بڑھتی تھی اس کے
 علاوہ میاں افتخار الدین کا گرگس کی کم اور کمیونٹس زیادہ تھے۔ یہ کہ کاگرس کی زندگی
کی نظر سے یہ تھی نہیں تھا کہ وہ کاگرس میں کیرنسٹوں کی نفوذ کی ملکیت اس کے
تحت شامل ہوئے ہیں۔ ان کاگرسیوں کے خیال کی تائید میں اس وقت ہوئی
جب مسلم لیگ نے پوری طرح زور پکڑ لیا اور کمیونٹس پارٹی نے پاکستان کے قیام
کی حمایت شروع کی۔ جس کا گرگس مسلمانوں نے کمیونٹس پارٹی کے باوجود کاگرس کو
حیدر و مسلم لیگ میں شرکت کی ان میں میاں افتخار الدین بھی شامل تھے۔

۱۸۳۰ء کے اوائل میں پنجاب میں کانگریس کے مشہور لیڈر ڈاکٹر ستیہ پال نے
 "نیشل کانگریس" کے نام سے اردو روزنامہ نکھلا تو میں شاہکار چھوڑ کر اس میں
 چلا گیا۔ اس اخبار کا مقصد پنجاب میں کانگریس کی پالیسیوں کا پروجیکٹر اور فرقہ وارانہ
 ذہنیت کا مٹا دینا تھا۔ منتظلیں چاہتے تھے کہ اخبار کو چند روز سلائی دونوں
 بڑا عین۔ اس کے دورہ تحریر میں جہاں ایک طرف تو دانش جس جسرت اور باری
 علیک تھے، وہاں دوسری طرف ہندوستان میں رام دتا کی جگہ تھے۔ یہ نظریوں جسرت
 پنجاب کی مصالحت میں کوئی امتزاج تھے۔ لیکن یہ اہل قلم زیادہ تھے اور صحافی کم۔
 "مطلب" روز پر تاب کی دورانی پالیسی خواہ کچھ بھی ہو لیکن خبروں کے مسئلے
 میں یہ کافی اپوڈریٹ تھے۔ اس معاملے میں باری صاحب کو تو تصور ہی بہت
 سرحد پر تھی لیکن جسرت اور درفا صاحب کو تو اپنے زور قلم کی داد وصول
 کرنے کے سوا اور کئی باتیں دل چسپی ہی نہیں تھی۔ پھر کانگریس کارکنوں نے اخبار
 کے دفتر میں چند نفاذ ایجنٹ مارج قائم کر رکھا تھا۔ ہر شہر اور ہر قصبے کے کانگریس
 یہ چاہتے تھے کہ ان کے شہر یا قصبے کی کانگریس مرکز میں کی خبریں بہ صورت
 میں شائع ہوں جس کا نتیجہ اس اوقات یہ ہوا تاکہ دوسری اہم خبریں شائع ہونے
 سے رو جائیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ ایک کانگریس کارکن اس بات پر برہم
 ہو گیا تھا کہ اس کی مجلس کی چوری کی خبر شائع ہونے سے وہ کئی کتنی کٹا ہوا
 کانگریس ایجنٹ خبروں پر ڈاکٹر ستیہ پال کی سفاخری بھی نکھوالتے۔ ڈاکٹر صاحب
 کا نام اخبار پر چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے چھپتا تھا، ہندو ان
 کی سفاخری محکمہ نہ ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ ایک صاحب ان سے ایک ایسی

خبریں سنا۔ شاہکار نے جو سب سے خیال میں شائع نہیں ہوتی چاہیے تھی میں نے
 اسے شائع کر دیا۔ شاہکار کو یہ تو وہاں ہی خبر کو لے کر ہندوستان میں رام دتا کے
 پاس پہنچے۔ ہندوستان میں شائع کے اخبار تھے۔ انھوں نے اس تکلف و احتیاط
 کو دیکھ کر کہہ دیا تھا۔ میں اخبار پر ان کی حیثیت ملنے کا مقصد یہ تھا کہ ہم
 ایک اور قوت پر بھی ڈاکٹر ستیہ پال کانگریس کا سرچشمہ بن جائے۔
 ہونے کی بجائے کانگریس کے اس مخصوص دھڑے کا ترجمان زیادہ تھا جس کے
 قائد ڈاکٹر ستیہ پال تھے۔ اس کے کہوں میں کانگریس کے اندر دینی مت فتنوں کا
 بڑا خطرہ ہونے لگا۔ مجھے کانگریس کے دوسرے دھڑے کو جس کے لیڈر ڈاکٹر
 گوپی چند جھاگو تھے۔ اس کی تقریب پر آدھ کر دیا۔ اس مسئلے میں ایک بار ایک
 دلچسپ اتوجہ ہو کر کانگریس کے اختتام میں جہاں صدرت کے لیے کوئی چند جھاگو
 کے دھڑے کی طرف سے ڈاکٹر جیو امیدوار تھے وہاں ڈاکٹر ستیہ پال کے
 دھڑے نے ان کے مقابلے میں مولانا عبد القادر تصور کی کو ٹھکانا تھا۔ بقدرتی تھا
 ڈاکٹر ستیہ پال کانگریس کے کانوں میں عبد القادر تصور کی کی حریت کی جاتی تھیں۔
 اس کی حریت میں ایک شہرہ تھا کہ جس میں درج تھا: جہاں حریت میں مولانا
 عبد القادر تصور کی میں جرات اور پامردی کا ثبوت دیا ہے اس کی نظیر پنجاب
 میں نہیں ملے گی۔ اخبار چھپ کر آیا تو اس میں مولانا پامردی کا نام تھا اور اس
 کی جگہ نامزدی نے لے لی تھی۔ ڈاکٹر ستیہ پال دفتر میں آئے تو ان کا چہرہ ٹھٹھے
 سے شگفتہ ہوا تھا اور غلامی کے یہ فخر میں بھی نہ تھا۔ تحقیقات کی توجہ
 جھانک کر کاتب نے پامردی ہی لکھا تھا لیکن پروفنڈ نے ہر جائے حماقت

اسے تادمی میں مستقل کر دیا۔ پروف ڈی کو نو دا ہی ہزار کر دیا گیا لیکن چند ہی گھنٹے کے بعد ڈاکٹر صاحب دہس گئے اور کہنے لگے کہ اس پروف ڈی کو نو دا کچھ سے لازم کہ دیا جائے، وہ ہم سب سے زیادہ قتل مند تھا بعد ازاں ان کا تصور دیا واقعی ہمارے نکلے اور مقابلے سے دھرت بردار ہو گئے۔

نیشنل کانگریس نکلا تھا تو رام قتل و ہرجائی کے مطابق جو اس اخبار کے منتقد خصوصی تھے، اسے جڈت جو جہاں کی خبروں کی سرپرستی کا اصل تھی نہیں جڈت خبروں کی سرپرستی اسے زیادہ دن حاصل شدہ کی جس کی وجہ کانگریس کی سیاست کا اظہار تھا۔ ۱۹۳۰ء میں کانگریس کے صدر سچاں چندر بوس تھے۔ وہ جہاں کانگریس کے خصوصی منظور نظر تو کبھی نہیں تھے لیکن اس برس وہ کسی نہ کسی طرح جہاں کانگریس کو اس بات کا یقین دلانے میں کامیاب ہو گئے تھے کہ جیسے اور سبسا پر وہ گلی ایمان لے آئے ہیں۔ اس کے صلے میں انہیں کانگریس کی صدارت دے دی گئی۔ کانگریس جیسے اپنے طور پر اعزاز نہیں صرف ایک برس کے لیے عطا تھا لیکن سچاں چندر بوس کے لیے آمادہ نہ ہو سکے کہ ان کا دور اقتدار بڑا مختصر ہو، چنانچہ آئندہ برس کے لیے وہ کانگریس کی کے علی الرغم ان کے امیدوار ڈاکٹر جی ایم سید زار امی کے مقابلے میں ہارے ہوئے۔ ڈاکٹر سید زار امی اور ان کے رفیق خصوصی سردار سرداروں کے ساتھ کانگریس سچاں چندر بوس کے سرگرم حامی تھے چنانچہ نیشنل کانگریس نے قدرتی طور پر سچاں چندر بوس کا ساتھ دیا پہلے صفحہ پر ان کی تصویر کے نیچے چھپا: چند راتوں کا بے نالغ باؤنڈا سچاں چندر بوس کا ظاہر ہے کہ اس کے بعد جڈت خبروں کی سرپرستی کا سلسلہ جاری نہیں رہ سکا تھا۔

نیشنل کانگریس کا عملہ ادارت سچاں چندر بوس کی حمایت جو نیست ام کی وجہ میری کے مصداق ہی نہیں کرتا تھا، اور اس کے جیسے بھی رکھنے ان کی بعد دیا ان اپنے طور پر سچاں چندر بوس کے ساتھ یقین چنانچہ ان کی جانت میں رکھتے وقت اس سلسلے کی خبروں کی سرخیاں قائم کرتے وقت ہر چلے نکلا ان کے قلم میں خاص طور پر پیدا ہوا تھا۔ سچاں چندر بوس نے انتخاب جیت لیا تو نیشنل کانگریس کے دفتر میں بھی خاص جنوں کی کیفیت پیدا ہو گئی کہ کوئی دکان دار ناچ رہا تھا۔ یہ کیفیت دونوں طاری کی کہ چنانچہ ٹھکے کے مالکین میں کوئی حیکموا ہو نا تو وہ ایک دوسرے کے لیے جانا بھی کا نام بطور گالی مستعمل کرتے۔

بسیب کچھ میں نیشنل کانگریس کی دانشمندی بڑھ رہی تھی اسے شہناز بھل رہے تھے۔ نتیجتاً اس کی حالت ڈاکٹر ڈی کو نو دا کی جیڑا سحر سحر اور باری علیک کو وہ بخوشی بہت دہس رہی تھی چنانچہ ان کے دفتر میں بھی بڑی طرح کھلتی تھی چنانچہ ان کا مزہ زیادہ دن دن ہو سکا اور وہ نیشنل کانگریس چھوڑ کر ایک اور اخبار سنبھارا۔ میں چلے گئے اور جاتے جاتے اپنے ساتھ مسلم کاتبوں کو بھی لے گئے۔ وہ اپنے ساتھ لے گئے بھی لے جانا چاہتے تھے لیکن سبب دار سیاسی طور پر گرا چکا تھا اس لیے نیشنل کانگریس سے علیحدگی گرا نا نہ ہوئی۔ کانگریس نے سچاں چندر بوس کی کامیابی کو اپنی شکست سے تعبیر کیا لیکن ان کے بیان کے سبب دلچسپی سے غماز ہوتا تھا کہ وہ اس شکست پر قانع نہ کرنے والے نہیں، انہیں کانگریس و وٹروں کی عدم مصالحت کا بھی احساس ہو

ملک اور یہ احساس بھی کہ کانگریس میں لوگوں میں بھرتی ہوتی ہے۔ اس زمانے میں
 انھیں یہ بھی یاد آ گیا کہ راجیکوٹ کے دورے وہ وہ علاقے کی ہے اور اپنی رعایا کو کچھ
 ایسے حقوق نہیں دے چکا اس لئے وعدہ کر رکھا تھا چنانچہ جھڑ کا کانگریس کی
 سیاست سے کنارہ کشی کر کے وہ راجیکوٹ چلے گئے اور راجہ صاحب کی
 جہاد پر قلب کے لیے اپنا بہت غرض کر دیا۔ بہت غرض ہو تا تھا کہ ہندوستان
 کی ساری توجہ تری پورہ کی بجائے جہاں کانگریس کا جلال میں ہوتا تھا راجیکوٹ
 پر مرکوز ہو گئی اور اس طرح یہ ثابت ہو گیا کہ کانگریس کا صدر رخا کوئی ہومو سیکس
 اس کے حقیقی لیڈر رہا تھا کانگریس میں ہیں۔ اور ہر کانگریس وہ رنگ کشی کے سبب
 نے سبھا ش چندر بوس سے تعاون کرنے سے انکار کر دیا جہاں باقی سبھی جماعتی طور
 پر مستثنی ہوئے وہاں ہندوستان کے ایک شخص کا احساس اب اس انتخاب
 جیسے گئے تھے لیکن ان کی ہمت ان میں اتنی تھی کہ سب ہندوؤں کے تعاون
 کے بغیر بھی وہ کانگریس کے نظام کو بچا سکیں۔ پھر کانگریس کی بے پناہ قبولیت
 کانگریس میں ان کے خلاف ہوتا تھا لہذا کانگریس پر قبضہ کرنے کو تھے انھیں صرف
 کانگریس کی صدارت سے ہی نہیں خود کانگریس سے بھی الگ ہونا پڑا۔

نیشنل کانگریس میں اب چند تیلہ رام دتا میں اور کچھ دوسرے قسم
 کے مخالف رہ گئے تھے لیکن وہ دن دور ہو چکا کہ جو جماعتی اتحاد اس لیے کام کی بنیادی
 تھی نہیں تھی بلکہ وہ دن بہ دن متنازعہ فرسائن کو سمجھتا تو انھیں تھا لیکن دل یہ
 مزہ دیکھتا تھا کہ سبھا ش چندر بوس کے ساتھ نہایت زیادتی ہوئی ہے اور یہ بھی کہ کانگریس
 بھی سبھا ش بابو سے اتنی رواداری بھی نہیں بہت رہے تھے وہ اپنے مخالفوں

سے برہتے ہیں۔ چنانچہ سبھا ش چندر بوس کی حمایت میں لکھتے وقت صوفی
 مشقت کی بجائے اس پر غصے کی اور لکھی کا لکھا کہ اگر تا سبھا ش زمانے کی اپنی
 ایک نظم کا ایک شعر یاد کیا ہے:

اس میں کچھ ہم انھوں کی بھی جفا خاں ہے
 کب فتنہ جو سے خبروں کے دل انگیز ہیں

نیشنل کانگریس نے سبھا ش کے راجہ کا ۱۹۳۹ء کے اوائل میں دہلی
 عالی جنگ شروع ہو گئی۔ نیشنل کانگریس کے بے وقوفی اور آزمائش تھا۔
 نیشنل کانگریس کانگریس کی کامیابی نہیں تھا بلکہ سبھا ش چندر بوس کے
 دھڑلے سے بھی تعلق رکھتا تھا جس کا وہ بنگالی سرگرمیوں کے معاملے میں اور بھی
 نمایاں تھا۔ اور سبھا ش ہندوستان کا قیام اور صوبہ بھارت کی بحالی وراثت
 جنگی سرگرمیوں کا براہ عملی تھی اور صوبے کے انتظام پر اس کی گرفت کافی مضبوط
 تھی۔ چند انجمنیں رہتے ہوئے جنگی سرگرمیوں کی صورتی سے معمولی مخالفت
 بھی اور بامیں رہ کر مگر کچھ سے جبرہ کہنے والی بات تھی۔

جنگ شروع ہوئے کچھ ہی مدت ہوئی تھی کہ ایک روز سبھا ش چند نے
 جو سبھا ش کی پریس ریلی میں ملازم تھے اور فیروز پور جیل کے نام سے
 اخباروں میں مضامین بھی لکھتے تھے انھیں سے کہا کہ پریس ریلی کے افسر اعلیٰ سید
 نور احمد محمد سے ملنا چاہتے ہیں۔ اور اگرچہ ان کے دفتر نامعلوم نہ ہوا تاہم حالات
 کہیں اور بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے سید نور احمد سے ان کے دفتر میں ملنے کا

حالات میں کسی ملک مسیح کے بعد سید صاحب نے مجھ سے چچا کر میں خیشل کا گرس میں ایک پیشہ وراخبار نویس کی حیثیت سے کام کرتا ہوں۔ اسی آدمی کوئی کی حیثیت سے؛ میرے کہ ایک پیشہ وراخبار نویس کی حیثیت سے۔ اگر سبھی آدمی کی حیثیت سے کام کر رہا ہوتا تو مغربی لباس کی بجائے کھدڑی پہنیں ہوتا۔ اس کے بعد انھوں نے جنگ سے پیچھے ہٹ کر صورت حال کا ذکر کیا اور یہ بھی فرمایا کہ کوئی حکومت جنگی سرگرمیوں میں مداخلت کو اور نہیں کر سکتی اور یہ کہ نہ جنگ میں دوست اور دشمن میں واضح خط امتیاز چھٹ جاتا ہے۔ میں نے اس بات سے بھی بلا تکلف اتفاق کر لیا۔

میرا خیال تھا کہ اس کے بعد وہ خیشل کا گرس کی ان کوتاہیوں کا ذکر کریں گے جو اس میں جنگی سرگرمیوں کے سلسلے میں سرزد ہوئی تھیں۔ انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ وہ میرا خیال ہے کہ ان کا کسی کوتاہی کی نشاندہی آسان بھی نہیں لگتی کیونکہ ہم اس معاملے میں بہت ہی مضبوط بن چکے تھے کہ قدم رکھتے تھے۔ یہ شکایت انھیں ضرور تھی کہ خیشل کا گرس میں یونیٹ وزارت پر قحط طاری لگائے جاتے ہیں اور یہ عزائمات کی تردید میں جو معاملے بھیجے جاتے ہیں انھیں شائع نہیں کیا جاتا جو آدابِ صحافت کے منافی ہے جس سے کہ ایک ایسا گروہ بھی ہو تا ہے تو ان سو سال کے ملک میں کسی نے خدہ پائین کا نتیجہ ہرگز نہیں دیکھا۔ گزشتہ سال کا گرس میں شائع شدہ کسی خبر یا خدہ سے کی واقعی سلی پر تردید نہ نظر ہو تو وہ تردید ہی برا سلی فون کر کے مجھے براہِ راست سمجھا دیا کریں۔

وہ ضرور شائع کیا جائے گا۔ ملت ہمارے حق محفوظ رہے گا۔ اگر ہم ضرورت سمجھیں تو مزید اظہار خیال کر سکیں۔

میرا خیال تھا کہ اس معاملے پر بات چیت ختم ہو جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ انھوں نے باتوں باتوں میں مجھے یہ خبر سنائی کہ ان کا ٹھکانہ اخبار نویسوں کو اجرت پر جسے کام دیتا ہے اور معاوضہ کی شرح کافی اونچی ہوتی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ جب وہ سرکاری ملازمت میں نہیں تھے تو ایک اخبار نویس کی حیثیت سے کام کرتے تھے تو یہ کام نہ خود بھی کریں گے تھے اور اب بھی کافی نامی گرامی اخبار نویس یہ کام کرتے ہیں۔ ان کی اس پیشکش کو میں نے منکر ہے کے ساتھ نامعلوم کر دیا کیونکہ ایک ایسا پیشہ اخبار سے وابستہ ہونے ہونے اس قسم کی سرکشی سے مستفید ہونا میرے خیال میں آدابِ صحافت کے منافی تھا۔

مکرہ حالات سے باہر نکلا تو سورتی چند میرے منتظر تھے۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا میں بات تو نہیں جو میں کہنے سے جھجک گیا ہوں۔ اگر ایسا ہے تو یہ بات میں ان کے توشل سے سید صاحب تک پہنچا سکتا ہوں۔ میں نے کہا کہ وہ بات انھوں نے خود ہی کہہ دی تھی لیکن میں نے اپنی مسند پر کی کا اخبار کر دیا ہے۔ میں نے اپنی گفتگو کا حاصل انھیں بتا دیا۔ انھیں میرے رویے پر کافی حیرت لگی کیونکہ بقول ان کے بڑے بڑے اخبار نویس یہ سید صاحب تک رسائی کے لیے ان کی خوشنودی کرتے رہتے تھے۔

سید قمر کا اپنی کو میں نے نصیاً صرف اس لیے نامعلوم کر دیا کہ میرے

نزدیک سے نظر کرنا خوش اطہاری کے منافی تھا اگرچہ ایک طرح کی اناہرہ سید
کاروائی ہوتی۔ جہاں تک صوفی سلسلہ کا تعلق ہے میری ہمدردیاں ان لوگوں کے
ساتھ مطلق نہیں رہی تھیں۔ جو مٹکی سرگرمیوں میں کسی قسم کی کاوش ڈالنا چاہتے تھے
جبکہ پہلے کھانا پکے اور پھر تعلق پنجاب میں اس مختصر سے گروپ کے ساتھ تھا
جائیم۔ اس رائے کے نظریات کا حامی تھا اور یہ بھی جانتے تھے کہ ایم۔ این
رائے اس جنگ کو سامراجی جنگ نہیں بلکہ جمہوریت اور فاشیزم کی لڑائی سمجھتے
تھے۔ ہر حال یہاں اس کے سامنے جو تکلیف دہ صورتحال کے لیے نظر آ رہے تھے، اس لیے ان
کی حمایت اور ترقی پسند پروا میں تھی۔ نوآبادیاتی ملکوں کے ترقی پسندوں کے
لیے تو ایسا اگر انداز بھی درست تھا تو گنگا ایم۔ این۔ رائے کے نظریے کے مطابق
اس جنگ میں اتحادی ملکوں کی کامیابی ان کے اپنے ملکوں کی آزادی کا پیش قدمی تھی
اور حضرت فیضی کا گروپ اسے جو ذہنی تعلق تھا وہ ختم ہو رہا تھا اور یہی
قوم پرستی سے ایمان کا خطرہ تھا اور دوسری طرف، اخبار کی حالت ڈانڈا دل ہو رہا
تھی جسے کو پہلے تو انہیں ناخوشیت تھی مگر اب وہ سب سے سلسلہ قریب قریب محفوظ
ہو گیا۔ غالباً اخبار جاننے والوں کو سمجھا چند برس کے گروپ یا کسی اور طرف
سے اپنی آزادی کی توقع تھی وہ پوری نہیں ہوئی۔ قطع امید کے بعد اگر اخبار فوراً
ہی بند کر دیا جاتا تو شاید کچھ نفسیاتی نہ ہوئی لیکن اخبار کو بند کرنے کے لیے مختصر
کا کھینچا ہے۔ چنانچہ قریب سے دھمکتے گئے اور طاعونوں سے خوفستہ وعدوں کی سڑ
سے کامیاب جاتا رہا۔ سب سے زیادہ بڑی حالت کا تھوڑی کچی، اخبار نویسوں
کا کھنڈر بہت عرصہ احباب پر رہا ہے جو وقت بے وقت ان کی مدد کر رہا ہے

کاتب مختصر نے خاص ضرورتوں پر انہیں ایسے ہمدردوں کو ان کو اس سے ملنے دیکھ
کر انہیں دیکھی تکلیف ہوئی تھی کہ جہاں ان پر فائزے پڑ رہے ہیں وہاں ان لوگوں کے
معاوضہ نہ ملے گا۔ ان کی اکثر شکایات کا جواب ایک سہارا تھا۔ میری فرق نہیں آیا آخر تک
ان کو انھوں نے ہڑتال کا فیصلہ کر دیا اور وہ ان کی بے ضرورت میڈروں کا دھڑ
کھٹکھٹانے لگے۔

مزدور میڈروں میں سوشلسٹ و کمیونسٹ بھی تھے لیکن کوئی کامیابی
حد کو تیز نہ ہو رہی تھی۔ سوشلسٹوں کی کئی مقبول تھی اور سوشلی
سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کے ساتھ ان کے مراسم تھے۔ کوئی اس کے لیے تیار نہیں
تھا کہ ہڑتال کی راہ نہ لے لے۔ ان کے سوشلسٹوں کی دھڑے کی ناراضگی سول
لے۔ دلیل وہ یہ ہے کہ ہڑتال کا حربہ کاروباری قسم کے لوگوں کے
خلاف ہی کامیاب ہو سکتا ہے۔ سیاسی سرگرمیوں کے کھنڈر کی کافی ڈھیل
ہوتے ہیں ان کی ہڑتال اور کمیونسٹ ہڑتال جیسے حربوں کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا
آخر کار انھوں نے مزدور میڈروں سے بے نیاز ہو کر خود ہی ہڑتال کر دی۔
اگر منتظرین سمجھ رہے ہوں تو بہت فکری تھا کہ ان کو خود ہی بہت خواہی
دے کر معائنہ کیا جیسے لیکن سرمایہ داری کے خلاف جہاد کے مدھیوں نے
ایسے نہیں کیا اور وہ سبھی ترقی یافتہ دنیا کے جہاد کا وہ سرمایہ داروں پر انہیں
لگاتے رہتے تھے جسے میں سمجھتا ہوں کہ ان کی کوشش بھی کچی گئی اور یہ کوشش
بھی کی گئی کہ اخبار نویسوں اور کاتبوں کے ہاتھ باندھا جاتا رہا۔ ان کی ان
کوششوں نے منتظرین کی کچھ امید کو ہی سہی ہڑتال اور کچھ فکری کوششوں کے لیے ناخوش

اس نے وہ مڑا تل ایک دن جاری رکھی لیکن جب قاضی ایک بیستر آئے تو
اکھا کر چلا آیا۔

کاتبوں کی زبان زیادہ دن چل سکی جب تک پیشل کانگریس کے
کاتب مڑنا نہ رہتے وہ سب کچھ دیکھ کر جیسے کے بے لگوں کو حق کر رہے تھے
جب انھیں مختلف گروہوں میں تقسیم کی گئی تو ان کی کچھانی کے موافق بھی کم
ہو گئے اور ان کا جو فرض مل بھی ختم ہوا گیا۔

ڈاکٹر سنے پارکھ سے کافی دن کشیدہ خاطر رہے لیکن پھر ایک مشورہ
دوست نے پنج میں پڑا تو ان کا فتنہ ختم کر دیا ایک بار پوچھنے گئے تھے
یہ سب کیوں کر؟ اس نے کہا ڈاکٹر صاحب قوم لوہے سے ٹکراتے ہیں۔ آپ
گنگا خندی میں بھی خندی ٹکراتی ہو گی!

ان کے ہنسے سن کر وہ سچا سچے کا وقت سمجھنے میں کسی خاص ذہنی
کوشش کی کار آمد نہیں ہوا۔ جب یہ سب سچائی نے مجھ پر حملہ کیا تھا تو شیخ
کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا تھا۔ دیکھا بھی تھا لیکن میں نے میرے ذہن
کی اس وقت کی پڑائی کے لیے خاص طور پر یاد کر رکھا تھا وہ ہندوستانی
کے سب سے بڑے کالم نویس کی تحریریں تھیں۔ ان کی یہ تحریریں اتنا ایک نہ تھیں
اختیار سے یاد رکھنی تھیں ان میں شیخ کی پوری تعلیم کا حصہ میں اس وقت کے
ایک بے ماری بیستر نے کتاب کی شکل میں شائع کیا تھا۔ میں نے ان کا انور
میں نہ صرف یہی شائع کیا تھا۔

کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی اور جب تک میرا یہ عزت بچنے کی کوئی مشورہ
نہیں تھی۔ آخر میں کراؤنگ کے منظر ہروں کا فیصلہ کیا۔ منظر ہروں کا ہدف ڈاکٹر
ستیا پال کی کوئی تھی۔ بیجا پین کو مڑنا تھی غور کی تھی مجھ کو دوسرے کاتب اور
نہ یہ وہ مادیوں کے جیسے ہوئے کچھ آدمی بھی پہنچ گئے۔ اس طرح چاروں مادیوں
کا ایک ہر گیا۔ مستقبل میں اس سے پہلے ہر تالیف کو کافی حقارت کی نظر سے دیکھتے
تھے لیکن جیسے ہی ان کا زور باور اور مردہ ہوا کے غور سے جلد ہوئے ان کا مزاج ختم
پا گیا اور تقریباً نہیں ہی منہ کے بعد ان کا بیجا سمجھا کہ وہ بات حیرت کے لیے
تیار تھی۔ ان کی پیش کش تھی کہ ہر طرز سکس کی نصف تنخواہ اور دیکھ کر دیکھ کر
اس کے ساتھ ہی ابھی ملے یا ایک لکھ بھی ان پر وہ دن بھر کھانے کے ہر رکھ کو بھول
کیا جاتے گا۔ وہ جیسی کہتنی تنخواہ باقی ہے وہ بھی وہ کی جائے گی۔ ایک ایسے اعتبار
کے مستقبل میں ان طرف سے جو مجھ پر کچھ پیش کش خیریت تھی۔ میں نے اپنے ساتھیوں
مشورہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ اسے منظور کر لیا اور وہ صاحب ہر ہر کے بعد
معاذ ختم ہو گیا۔

یہ ایک طرز سے میری حیرت تھی مرد و زوروں کے پیشہ ور بیوروں کو یہ
بات ناگوار لگ رہی۔ انہوں نے مل سٹاف میں ایک کھیل بھی تھا جس کا
کیونستوں کے ہوا اگر وہ پ کے ساتھ حق تھا۔ اسے کس نے کیا کہ وہ میرے
خلاف برپا ہو چکا تھا کہ میں ان کو ملے میں لکھا ہوں۔ کچھ اور نے اس کی
بات پر کان نہ دھرا تو بہت جلد ہی کہ وہ خود ہی مادیوں میں داخل ہوا اور باقی ماندہ
تنخواہ کی وصولی کے لیے ڈاکٹر ستیا پال کی کوئی کے سلسلے میں ہر مڑنا لگ رہی۔

مارکی کلاب اور بی بی سی کی خدمت ہوتا تھا ان شخصوں میں بھی اس نے
برطانوی نوآبادی کاروں کے لیے بڑی خدمت زبان استعمال کی تھی لیکن اس کا
کو اس نے تسلیم کیا تھا کہ وہ مسلمان کی ترقی اور آزادی کی ایک صورت تھی
جو کھپنے کے بعد ہی دوسری آبادیوں کے سامنے پیش کی جانی چاہئے۔
جیسے ہی کسی برطانوی نوآبادی کی ترقی ہو کر وہ ایک آزاد ملک بن جائے
تو اسے اپنا جواز دینا پڑے گا کہ اس نے آزادی کی ترقی کی تھی۔
مشارکت مارکی نے دیکھی تھی وہ اس کی ترقی کی تھی۔

جنگ کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے لئے وقت کو ان کے لیے سب سے زیادہ
مہم چیز ہے۔ ایک فوری عمل کا آغاز کرنا چاہیے تاکہ وہ اس جنگ کے خطرے پر
جنگ سے متعلق ہو کر رہیں۔ جو کہ ایک پارٹی بنا کر ان کو کیا جاسکتا ہے کسی
موقت اور فوری طور پر ان کے لئے جاننا ضروری ہے۔ ان کے لئے اس کے ساتھ
مذاہباتی ہم آہنگی پیدا کرنا۔ انہیں یہ بتانا کہ جنگ شروع ہونے کے لیے یہ ان کے لئے
ہو یا نہیں۔ ان کے لیے یہ کہ ان کو امتداد مل رہی ہے۔ اس کے لیے ان کے لئے ان میں
عبداللہ مصداق کی توجہ جو یہاں تھا کہ اس کے بارے میں سب سے پہلے ایمان
لے رہے تھے۔ عبداللہ مصداق اس سے بھاگ نکلے۔ دوسرے دن چنگا کر
گرداب کے ایک اور گہرے حصے میں ہونے لگی تھی۔ وہ وہاں فرار کی ایک
فرم میں ملازم تھے۔ فرم کا کچھ دوسرے جنگ میں تھے۔ ان کے لئے اس میں
ملازمین کہاں گئے اس کا صحیح طور پر کسی کو علم نہیں تھا۔ لیکن ان میں سے ایک عبداللہ
مصداق کے لئے اس انتظار کی وجہ سے کہ جو اس کے بارے میں وہاں رہا۔ وہاں رہا۔ وہاں رہا۔ وہاں رہا۔

دوسرے چلے گئے تھے۔ اس غیاب کی خبر ۱۹۴۲ء میں ہوئی جب کہ سرحد ہندوستان واپس آئے۔ ان دنوں وہ قادیان میں، ان کا بیان ہے کہ وہ دوسرے
مصدقہ قادیان کے اور افسانہ سال کا یہ مصوبہ مقرر کرنے کے بعد نکلا گیا ہے۔ تو
انتخاب کی وجہ یہ کہ یہ سو وٹ پولیس نے انھیں گرفتار کیا اگر قادیان
کے فوراً بعد انھیں ایک دوسرے الگ کر دیا گیا، عبداللہ مصدق کا کیا حشر
چو اس کا انھیں علم نہیں تھا کہ خود انھیں دستگیر کیا جائے گا۔ چو اس
مصدقہ چلے گئے تھے۔ یہی انھیں تین سال کی سزا دی گئی اور نفاق کے شقت کے
کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ ستمبر ۱۹۴۴ء میں انھیں شقت کے کیمپ سے نکال کر
قازقستان کے ایک شہر میں لے جایا گیا جہاں وہ پولیس کی نگرانی میں ۱۹۴۷ء
تک رہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد انھیں ہندوستان واپس لے کر دوسرے مقرر کیے۔ تاہم
یہ خود کافی ہیچ دیا گیا لیکن تین ہی مہینے بعد انھیں واپس قازقستان بھیج دیا گیا
تاکہ وہ وہاں دوسرے نفاق کے تعلیم حاصل کریں۔ لیکن وہ وہاں تک بھی نہیں پہنچے۔
فروری یا مارچ انھیں بغیر پولیس کے گرفتار کر لیا اور اس مرتبہ پچیس برس کی سزا
دے کر انھیں سانچہ راجھ دیا گیا۔ اور اس قادیان کے ایک کونجی اور سو وٹ
دشمن پر دیکھ کر وہ جانے کتنی مدت تک وہ اپنے جد پر دستِ انقلاب کی
سزا سنبھالتے تھے۔ ۱۹۶۲ء میں حکومت ہند کی مداخلت پر انھیں ہندوستان
واپس لانے کی اجازت مل گئی۔ وہ وہاں ہندوستان میں انھیں غرضی کے
رو کی کیمپوں کا قادیان بھیج دیا۔ غالباً ان دنوں وہ اپنی آپ بیتی لکھ رہے
ہیں۔

ہمارے سوتھ کی بنیاد خالص استدلال پر تھی اور جنگ کے خاتمے
 نے ہماری استدلال کو صحیح ثابت کر دیا لیکن ملک کا حال اُن دنوں ہندوؤں
 طرز پر تھا مختلف تھا کہ انہماں و تقسیم کی کھڑے یا وہ گھبراہٹ میں تھی۔ لوگ ہمارے سوتھ
 سمجھنے آتے بکثرت کے دو ان میں ایسا نظر آتا تھا کہ ہری بات ابلی کی کچھ میں آکر مجھ سے
 لیکن آخر میں وہ صرف ایک بات کہتے: دول نہیں دانتا دو دھرتی ختم ہو جاتی۔
 اندھیل اور انگریزی اٹل ہوتا ہے وہ ہمدرد تھا کہ میں ہر قسم کا لے کر آئے
 تھے بہت بہت اچھے دوست ہی تھے تھے ان کی اپنا جنگی کامیابیوں کا بھی ثبوت کافی تھا
 کہ وہ اپنے عقائد کے لیے اپنی جان کی بازی لگانے کو تیار ہو سکے لیکن اندھیل
 نے تو ایک اور مثال بھی دیکھ کر ان کی عقیدے کے دوران میں مجھ سے بے چارہ کہ اس
 کے کچھ کمزوروں میں سے ایک سرکاری گواہ بننے والے تھے تو جہاں انگریزی قتل اور کچھ اور
 دو بیٹوں کے مشورے سے اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ بیس کو مگرہ کرنے کے لیے خود
 ہی سرکاری گواہ بن جائے۔ سرکاری گواہ بن کر اس نے ہر انتہائی انداز میں ہر
 تو اپنے سرے لیا یا ان افکار میں کے سرزنش و دباؤ اور غلطی، اقدامات کے سلسلے
 میں جو کہ جو چکے تھے یا مفروضے تھے۔ اپنے ان ساتھیوں کو جو اس کے ساتھ
 بخواتین تھے اس نے سادہ سادہ سرکار نے بعد میں اس کے عزائم کو بھی غائب کیا
 است و عدہ صرف گواہ قرار دیا گیا اور پچاسی کی سزا دی گئی جو بعد میں عمر قید میں
 تبدیل ہو گئی۔ لیکن اب کام میں نے کر دیا تھا پولیس کو سزا دی گئی تھی مگر ایک
 جہاں انگریزیوں کا کوئی ہے کہ اگر اندھیل یہ دیکر تالیف کے کی لوگ جنہیں صرف عمر قید
 کی سزا دی گئی تھی پکے ہوئے۔

خدا میرے کہ اندھیل کی لڑائی بے مثال تھی۔ اس نے اپنے پیروں پر
 شہادت کے فرائض کی جوئے رسوائی کی سب سے بڑی لڑائی تھی۔ اندھیل کے
 غریبوں کے درمیان بھی انہی جو جو ہر سال ہے لیکن اپنے ساتھیوں کی بھاری کا
 تکرار گارڈ وہ ہر سال کا تھا کہ اس نے اپنے ساتھیوں کو جانے کے لیے
 یہ کہی تو انہی میں اختلافات اور بات کی اس سے وہ غرضانہ تھا اور کیا ہو سکتا
 ہے ہندوؤں کی تھکوں دونوں کو اس کی بات میں نہ سمجھ سکے۔ وہ ہری بات
 سمجھنے کے لیے کہ انہی کو کہی کہ تم چاروں کو گھبراہٹ میں دیکھو۔ فی اور میں یہ
 کہتا تھا کہ وہ کال کر رہے تھے لیکن آخر میں اندھیل نے مجھ سے کہا: ہندوؤں کی بات
 دانت تو انہی کے دل میں دانتا ہے وہ ہری اور اس کی دوستی ختم ہو گئی۔
 اندھیل اب اس دنیا میں نہیں رہتا۔ جب انگریزوں نے انہی کے سر پر
 بھی قائم ہیں۔

اندھیل کے کردار کی ایک اور خوبی بھی سامنے آئی۔ وہ جیل سے چھوٹے
 تو نہیں، اور جنگ کی ساری ساری لڑائی جیتا تھی۔ وہ ان کے چند دوستوں
 جو ان کی بات کا شوق تھے وہ نہیں کیا ان کے خلاف کے لیے کچھ چند دھڑک کر
 جاتے۔ اندھیل نے ان میں جو کو یہ کہہ کر سزا کو دیا کہ وہ انہی کے تو صرف اتنی
 رقم جمع کر۔ بہت سے میرے نے زبردستی کی۔

اندھیل نے ان دنوں کی مختلف میں زندہ رہا ہو سکتا ہے۔ اس کی طرح ہندو
 میں وہ ایک طرح سے متنازع تھا کہ اس نے ہندوؤں کی شہادت کو دیا
 اسی عالم میں وہ لکھا تھا کہ انہی کی کسی کے سامنے اس نے بہت سوال و در

نہیں کیا۔ اس کے گرد ان کا غولہ کے دوست ہی نہیں دشمن بھی معترف تھے جس قدر
 یہاں سے غرقہ کی منزل ہوئی، اس ہی سرکاری کہیں اس کے بارہ چار پر غولہ تھے۔ جب
 اندر پاں چلی سے چھوٹ کر آیا تو وہ کہا کرتے تھے کہ اس شخص کے ہاتھ چھو نہیں
 دوست سمجھتا ہوں اگر چہ اسے سچے مٹی کے تختے ٹک پختا نے کی میں نے ہر شخص
 کو شش کی۔

مذہبی اور جماعتی مصلحتوں کی ہر وقت نگرانی ہوتی تھی اور سیانی آدمی کا
 ایک ایک آدمی کے ساتھ ان کے ساتھ لگا رہتا تھا۔ وہ دونوں ایک ہی وقت
 میں غرقہ ہاتھ تو دروازے پر دوسرا ہی موجود ہوتے لیکن ان کی آمد
 سے نہیں سے کبھی کوئی مشکل پیدا نہیں کی ہوتی اگر ایک دن ایک رستہ پر
 جہاز چلی جاتا تو ایک دن سب اگر کہتے تھے: مثل صاحب آپ مجھے نہیں
 جانتے لیکن میں آپ کو بولتا ہوں۔ آپ کو خوش نظر لاہر یہاں سے پڑوسی
 تھے اور آپ کی وجہ سے کوئی جھگڑا میری نیند قابض نہ رہی پڑوسی آپ کے مکان
 کی گولی گرتی تھی لیکن میں اس غلط فہمی میں مبتلا رہا کہ وہ میری نگرانی کر رہی
 پنجاب میں جنگی سرگرمیوں کے خلاف گروہوں کی کوئی تحریک نہیں جیسی
 لیکن کچھ سوخت گئی تھی۔ کوئی اشتہار یا غلط قانون اخبار سچا پ
 دیتے تھے۔ جہاں گھری اخبار اور اندر پاں چھوٹے دونوں سوخت گئی پارتی میں
 تھے اس لیے ان کے بعض مصلحتی اس غلط فہمی میں تھے کہ شاید میری ہمدردی
 بھی اس پارتی کے ساتھ میں ان میں سے کشتہ میرے پاس چلے گئے اور کچھ
 نہیں ہے کہ جانتے کے بعد اگر ان کے ذہن میں نہیں ہوتے تھے تو کم سے کم

اتنا تو ہر گاہ کی سزا کہ وہ غضب برپائی میں مبتلا ہو جاتے تھے۔

جنگ کے فطیل اور بچوں اور شاہروں کے لیے روزگار کے دروازے
 کھل گئے فیض احمد فیض، جہاز میں مسرت، در و در سے کئی ادیب فوج میں
 عازم ہو گئے۔ ان اشراف نے ان میں بہت سے فوجیوں کو پہلے ہی عازمت دل چکی تھی۔
 اب جو باقی تھے وہ بھی اس میں کھپ گئے۔ باقاعدہ تعلیم کی حقیقت کے لیے سزا
 تھی لیکن انھوں نے اپنی لگ و دوست اس شخص پر قابو پایا حکومت ہند نے
 ساگت پیلے کے نام سے شاعری اور موسیقی کے ذریعہ ان پر چار کا ٹکڑا قائم کیا
 تو اس کی ذرا تحریک دہلی کے تختے میں آئی۔ آدمی نہ کہ تھے اور ان کی عورتیں ان کی
 نظر میں تھیں۔ جہاز اپنے نائب کے طور پر انھوں نے بدلتی رہی چند اشعار کا انتخاب
 کیا جو تعلیم یافتہ سمجھتے اور سرکاری عازمت کے طویل تجربے کے باعث دشمن
 اور سے بھی کوئی واقف تھے۔

یہ غور ملاحظہ کیجئے کہ انھوں نے ان کے لیے شاعروں سے
 جنگ کی حمایت میں گیت بھی لکھوا۔ تاہم اس فقرے سے پہلے کہ شاعر نے
 حقیقت کے سخت غلاف سے جس میں ان کے مزاج کی کسی خفا سے کہیں زیادہ
 ان کی فخر منوی ملی کا سیاہی کو دخل نہ لیکن جیسے ہی وہ ساگت پیلے کے ہاتھ کیڑ
 جے، ان شاعروں کو ان کی ذات اور ان کے کام میں ہر قسم کے خاموشی نظر آنے لگے۔ یہ
 بات حقیقت کے حق میں جاتی ہے کہ انھوں نے کسی شاعر کے خلاف بغض سے کام
 نہیں لیا اور شاعروں میں خرابی اور گیت نویسی کے سلسلے میں شاعر کو ج

کاظم ہے

تکبر کا سلسلہ منقطع ہوا تو اس آتش فشاں کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے۔
وہ مرتضیٰ مرزا اور جوش احمد تھے اور ان کی طرح صرف کچھ نہیں بلکہ صورت مند
تھے بلکہ دوسروں پر کافورِ جاہوت شعلہ بھی کر سکتے تھے۔ اس لیے انھیں خود
اپنے کھنڈوں میں جبری پیرائی کا سامنہ کرنا پڑا۔ ہر دوسری مہینہ گزرتے گزرتے
وہ پٹا بھی کافی کرتے تھے۔ خواہ سبب انھیں اس سٹریش کے گھسپا چاہئے
خاتون پر چائے پینے اور دوسروں کی ملکہ وڈ کے لیتورائز میں تو اٹھ کر نہ
ادب لطیف کے اہل بیرون کو کھوا دے ماننے نام کی عمارت تھی۔ وہ ایک طرح
سے یہ عہدہ اہل ادا کی تھا۔ کچھ سہولت شہرت کا۔ ادب لطیف۔ چو کدا ایک
اچھا ذوق ملا۔ اس کے اندر لڑا جھڑپنے میں ملکوں کو کوئی خاص مشکل پیش نہیں
آتی تھی۔ مگر دوسری دلی کی زبان پر ہے تو یہ عہدہ انھیں جو نوبہ باگین۔ بہتر
لی رہا دلی کو اس عہدہ میں تھی۔ اس کے گہنہ نہ یاد وہ جو جس کے ملک بہرہ
نہ تھا تو اس میں بہتر نہ کر دیا کرتے تھے۔ اس بنا پر انھیں اور ان کی مولا میں بھی
چھوٹے ہی ہوتی تھی۔ دوسرے کو اپنے ذوق بہرہ پر گزرتے کے لیے اس میں کٹھ
اور دوسرے میں مول بہرہ اور ان کے ساتھ تمام اسرار کرنے کے لیے تھے۔
یہ وہ زمانہ ہے کہ ان کی بھی ساتھ کو خوب آتا تھا وہ جانتے تھے کہ جس راں شہرت
بہتر وہ دلیو سے کہ جس شہرت زیادہ سے زیادہ غلط نہیں کیے پائی تو انھیں
سویلا پڑا انھیں۔ غرض حال سو کی تھا اور میں تھا کہ وہ سوتی میں تقسیم کر دیا۔
غرض یہ کہ اس کے بعد وہ سرائے لٹھی تھا پناہ مند ان مشکل نہیں تھا اور پہلے اہل

کے اتنی جلد ختم ہو جائے کوئی آسانی سے کتاب کہنے پناہ مقبولیت کا نام دیا
جا سکتا تھا۔

یہاں بیٹے کا ان دنوں سبھی ادیبوں اور شاعروں کو جنوں تھا۔ اس کو بھی اس
معاذے میں کچھ نہیں تھے۔ لیکن یہ نکتہ بھی ان کی نظر میں تھا کہ
حاشیہ شیوہ و زنداہی پر کاش با شد
زیر کاش وہ نہیں تھے۔ اس لیے بہت ہی عجیب رنگ پیدا کر دے سکتے تھے۔
ان کی نظر چٹکتے۔ جو کسی نظم میں اگر کافی مشہور ہو گئی ہے۔ وہ انھوں نے اسی
نظم میں لکھی تھی۔ اس نظم کا ایک مصرعہ تھا۔

غریب کی ہم جنس رادھا کی بیٹی

کسی نے اس سے کہا کہ حاش کو خدو کی ہم جنس کہنے کا جاہر منہ میں نہ
خطا ہو جائیں گے اور انھیں پیشیں گے۔ اس طرح نے فرمایا یہ مصرعہ اس طرح جلا یا
زلیف کی ہم جنس رادھا کی بیٹی

جب کچھ دوستوں نے یہ کہا کہ حاش کو رادھا کا بیٹی کہنے پر ہندو ہی برہمن ہو سکتے
ہیں تو اس طرح نے کہا ہندو پیشیں گے نہیں۔

کہتے ہیں کہ حاش بیٹی ایک دن عورت پر کھلی کے کھجے کے نیچے کوئی حبیب
اصول رہے تھے کسی نے پوچھا۔ حاش کی رادھا ٹر رہے ہو۔ جواب دیا۔ ہوا کی رادھا
رہ ہوں جو گھر میں کونھی ہے۔ اس سوال پر گھر میں گھسہ سوتی شرک پر کول
کی حوازی جاری ہے۔ حاش نے جواب دیا گھر میں دوشنی جو نہیں۔

قرنی لہدی کے تھنی نو جوانوں کی یہ گزری اکثر دیکھی گئی ہے۔ مراد جو

عقائد کے خلاف چاروں کے مصلحت میں وہ اپنی فوج باعلوم انجی کو شہر پر منہ زل
کرتے ہیں جہاں رتوں کا کم سے کم اندیشہ ہو۔ لندن میں جو ہم نوجوانوں کے لیڈر
دارق علی سے جب کسی نے یہ کہہ کر وہ اپنی برائی کا مظاہرہ پاکستہ میں سے کیوں نہیں
کرنا تو اس نے فوراً جواب دیا: وہاں بگے گرنے کا کرنا کیا جائے گا۔

بڑا تیری چند اختر جو رنگ بپٹی کے شے میں حنفیہ عالم دہری کے
نائب جتے ہیں۔ وہ ان کی علمی آوی تھے۔ فاروز زہاں اور ارواد سے کثرت
ان کی مشورات کا یہ عام تھا کہ یہ بات بظاہر یہ کہی جو سختی میں کہیں چیز کا اخص علم
نبیہ وہ اس تاہم کی نہیں کہ نہ سے جانا جائے۔ ان کا بھوپا ایک سالہ بھی ہے جس کی
جائزہ میں انھیں ہمیشہ جتا مستاد سمجھا جاتا ہے۔ ان کی ادبی زندگی کے آغاز میں
ایک دن میں حنفیہ عالم دہری اور ان کے پاس جتے تھا۔ موضوع گفتگو یہ تھا کہ
اگر ادیب کو ذریعہ معاش بنانا ہو تو صرف شاعری سے کام نہیں چلتا۔ مزدوری یہ
ہے کہ نثر نگاری میں کمال حاصل کیا جائے۔ نثر نویسی پر بات چلی تو ہمیں چند
اختر نے جتے تھے۔ اب یہ کہنا۔ عقل انظم میں ذہن کا خلا تو ایک اخص بھی
رکھ سکتا ہے لیکن نثر میں ذہن پر گہرا اثر مشکل ہے۔ میں نے ان کی اس بات
کو گھر سے یاد رہا۔ میرا خیال ہے کہ میں اگر بری کسی نثر لکھ رہا ہوں تو اس میں
ہری چند اختر کی اس راہنمائی کو برا داخل ہے۔ بعد میں جب وہ میری نثر کی دلو
دیا کرتے تھے تو میں انھیں ان کا قول یاد دلانا تھا۔ اس بنا پر جب میں ان کی
شاگردی کا اعتراف کرتا تو وہ کہہ کرتے تھے کہ یہ بات تو میرے تقریباً ہر

انسان سے کہی ہے اور تم سے تو اسے ہی سرسری طور پر کہی تھی۔

بڑا تیری چند اختر جتے ذہنی اور ذہنی علم تھے۔ اسے ہی بڑا سخی بھی
تھے۔ لطیف گوئی میں وہ بہت سادہ کو چھوڑ کر کوئی بھی ان کا ہتھیار
نہیں تھا۔ جتے اختر کو جلیوں میں اڑا دیتے۔ حنفیہ باز مذاہب لاہور کے
حرفیوں کا استدلال سے رک دینے کا کام لکھتے ہیں۔ نثر کرتے تھے اور ان
پر تنبیہ کے ترور سادہ دہری چند اختر کا کام تھا۔

ایک صاحب ہندت اچ خاں اراک تھے۔ ان کا موروثی تھا۔ موروثی
لاہور کے انھوں نے ایک سخی میں چھا تھا۔ زبان دانی پر بہت تامل تھے اور
اس سے بھی زیادہ اس بات پر کہ وہ آواز کے شاگرد ہیں۔ بات بات پر کہتے تھے
انھیں کہ گھنٹہ ہے۔ میں آواز کا شاگرد ہوں گھنٹہ کا لفظ جب ان کی نثر کی
برقی مومچل سے ہرگز نہ آتا تو انھیں دعوں کو گھنٹہ سنا دیتے۔ حنفیہ
باز سنا دیا۔ لاہور سے ان کی شخصیت کو سب معمولی ہری چند اختر ہیں۔ اس وقت
ہمارے میں گھنٹہ کے معنی سے دہری کے نام سے ایک نظم شائع ہوئی
جس کا ایک شعر تھا۔

تو آواز کا سنا ہر یاد آواز کا سنا اگر

دانی میں مگر سب تھے اشعار گھنٹہ

پر غصہ ہوتا تھا دہری کے ہر دے میں ہندت ہری چند اختر ہیں۔
راج خاں اراک کی سب سے مشہور ہوتی تو ختی کا چلی گئی۔ ایک
بڑی شاعر نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ وہ ایک گھنٹہ آواز ہیں بھلے باد

[illegible][illegible]

ایسی باتوں کی کہ بہت جلد سے ہرگز چل کر کوئی کی مقبولیت حاصل کرتی۔
پروفیسر میملان کی غیر ملکی مقبولیت ان کے حلقے خارج تھے اور دشمنوں سے
خائف تھے لیکن کچھ مقبولیت اور غیر ملکیوں کی افادہ زندگی کے لیے ضروری

گو کہ یہ کچھ کا بیشتر وقت سحر کرتا نہیں اور طبیعت کو یہوں میں گزرتا تھا اور
سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اپنی کامیابی کے قیاموں میں اور وہ کسی قابل توجہ نہ
تھا۔ جس کے لئے جتنے بھی تھے ان کے لئے وہ ان کا بیشتر وقت لے کر ان کے سب سے بڑے
میں رہتا تھا۔

مکرمہ فیض

یا جو عمارتیں ہیں ان کے کھنڈے اب بھی

غالب نے اس سزا کی تہی کے قریب ہی تھکے بیٹھ کر اسے لکھ کر مری چھوڑ دیا۔

Journal of Management Inquiry 18(6)

پھر جو کہے سے کام لیا اور وہ دے

یہاں پر دشمنوں کو اصرار ہے کہ یہی

ہجوم دوستانہ ہے اور میں ہوں

جائیں گے اور ہوتی ہیں، ملاقاتوں کے بعد ان کے

وہ مجھ کو سچوں جانتے ہیں میں ان کو یاد کرتا ہوں

اسلام اور معاشرت کے ساتھ ان کی شاعری میں جذبہ بھی تھا۔ یہ

حقیر بہت کم مروت ہے لیکن میرا رافضی دیکھاں :

فریاد بچوں کی

جوانے اور عجم خانے کی بات یہی طرف ازبکستان کے لیے ہے وہ نہ
چڑت مری چند اختران وہوں سے بے نیاز تھے اور میرزا علی ہے کہ یہاں
ہو کی علمی اور ادبی صلاحیتوں کو ان کی ذرا بھی اور ان کے قادیان سے
نقد ان پینچا یا وہاں کی غیر معمولی شرافت بھی ان کی تباہی کا باعث بنی۔
شرافت کو انہوں نے اپنے انصاف میں بنایا تھا جس پر ان جو بھائیوں کی
زبانی کی معرکت بھی ان کے بیشتر دوست خرابی تھے وہ ان کی معطلوں اور
سزا کے ہوئے تھے اور خرابی جو کہتے ہیں کہ ان کے انصاف کو اس کا
بے لگت کو بیچنے کی کرتے تھے ان کے ہاتھ کو غرض کو لکھنا اور
انہیں سے صاف پابندی سے ان کے ہاتھ لکھنا کہ وہ ان کا اور بھی نہیں تو ان کی
چراغ پر اور شرافت بھی جھلک اٹھتا تھا۔

میرزاؤں کے معاملے میں بھی وہ غیر معمولی انصاف نہ تھے۔ انہیں
مراہ و دستوں کے ساتھ ملو انہوں کے کو بیچنے پر اجازت نہ دیکھتے تھے
فی الجہن وہاں جاکر مرادوں سے وہ کوئی تفریق نہ تھے۔ ہر مشق نہ تھوڑا سا
تھے۔ سا لگت بلٹی کے بیچ کی ہر شے کے درمیان میں ان کا واسطہ خواہ انہوں
ت اکثر نہ تھے۔ جو انہیں ملے کے دوسرے دیکھ کے کہ وہ کو کچھ بھی
کا باعث بنی ہوں لیکن چڑت تھا اپنے صفا پرانے سنی میں گھر ہے۔ یہی وہ
لفظ ہے۔ ان سے بچے میرزا کا نام و چارہ نہ دیکھ کر ان کے ہاتھ میں سے
ہی کچھ نہ پاویں۔ ستم ظریف نکلی۔ یہ سا لگت بلٹی کی حالت ہے۔ یہ چڑت
کی بات ہے۔ چڑت چڑت کے وقت اس کے کھٹے پر بیٹھ خوش گئی ہوں

مصدقہ تھے۔ میں اس وقت جب نہایت ہی کھنڈر پکھڑی اپنے پورے
عروج دکھانا میں تھوڑے کچھ: نہایت ہی آگاہ کلی لوگ بہت سی بات ہو گئے
ہیں۔ آخر کس پر ان سے حاصل کرتے تھے اور کارروائی کھر جا کر۔

ظلم نہ رہی بھی ان کی عظمت نہ تھی ان کے تمام بہت دور تک تھے۔
اگر وہ ان اہرام کو اپنے دیوی عروج کے لیے استعمال کرتے تو کامیابی کی بڑی
اوجھی منزل پہنچ سکتے تھے لیکن حرف مطلب زبان ہلاکات کی مشابہت
بے نیازی کے مثالی مثال کے نیازی کے باوجود وہ عجیب و غریب قسم کے
لوگوں سے تھے۔ یہ تھے اور انہیں خوش رکھنے کی کوششوں میں بھی لگے تھے۔
ستیا ناکا شرف ہے:

صاحب کے ہونہ بلے سے ہر ایک کو گلہ ہے

میرزا ہونا میرزا میرزا کا مسد ہے

ستیا ناکا صاحب کی ہر زہرا جھول کو خالص وہاں
مناصہ کے بیچ نظر رکھتے کرتے تھے لیکن میرزا چند اختران غرض جھولنا
طور پر انجام دیتے رہے۔

کسی انگلو کو نہ دیکھ کر نہ انہی کے مندر جا کر وہ مگر تھوڑا سا
نروا گئی تاہم دوران انک لیتے تو یہ ان کے بچے بھی سفید ہونا اور اردو ادب
کے لیے تھی۔

شاخوں اور ادیبوں کی لوگ جھوک۔ میں کبھی کبھی کسی کے ساتھ زیادتی

بھی ہو باقی تھی۔ وہاں ہی وہ دوازے کے چوک میں ایک معتز شاہ عورت تھے غالباً
 انہیں قلعہ سے لے کر اپنے نام کے ساتھ حکیم لکھتے تھے وہ اپنے کمرے کے
 آگے شاہری سکھانے کا کاج کا پیر ڈنگا رکھا تھا۔ انھیں جو شامت اہمال
 نے کھیر تو کسی بات پر تاخیر سے بگاڑ پیر کر دیا تاخیر کھانے کے سبب طرفین
 وہاں سے نہیں ایک خزن شامت کے لیے بیچ دی وہاں سے یہ نوٹ کھو گیا کہ
 خزانہ حضرت توشیحی کی ہو گیا ہے۔ ہاں یہ دونوں کی جان کا مصمت توشیحی کی ہوئی ہو
 انھوں نے خزانہ ہی نوٹ کے ساتھ شاہی کر دی۔ حکیم صاحب نے نزل رکھی تو
 جانا کہ روئے مصمت توشیحی کا صاحب ہے کہ اگر برصورت اولیٰ کا پہلا درص
 یہاں جاسے اور جوینہ تروی کو دلیا جائے تو بڑی سختی عبادت ہی جاتی ہے۔ اس
 صنعت کے بعد وہ خود تاخیر سے حکیم صاحب کا نام لے کر انھیں ایک خوش گالی
 دے ڈالی تھی۔

حکیم صاحب پر ایک تہ ایک اور غلام بھی ہوا۔ وہ خدا کو نہیں مانتے تھے
 اور ان کے ہم عقیدہ کچھ نو جوان ان کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ گول بارگ لاہور کا ایک
 بہت بڑا پارک تھا۔ اس کے ایک گوشے میں والد جیت راسے کا بنٹ صاحب
 عظامی کے گرد و شاخ بچے ہوئے تھے حکیم صاحب اپنی منڈی کے ساتھ ہرنا
 ان میں سے ایک تھا گوگہ بیٹے اور یہ منڈی خدا کے خوف اپنا اور منڈی شروع کر دیتی
 اس جگہ سے کچھ فاصلے پر ناظر گیارہ لاکھ بیس تھا ایک دیں اس کے ملے کے کچھ
 لوگ ادھر آئے۔ انھیں نے حکیم صاحب کی منڈی کو کھڑے کیے دیکھا تو بڑی ناگوار
 محسوس کی اور انھیں دھڑکی لاسنتی دینے کے لیے اپنے باقی ساتھیوں کو بھی جگا

سب نے ان کو حکیم صاحب اور ان کے ساتھیوں کی بانی سفر شروع کر دی۔ بدلتی
 ہوا تپ سے کہ چلا اٹھوں نے ایک غلام انھیں کے تحت کیا تھا۔ اس خیال سے
 کہ کوئی فرقہ وارانہ سوال پیدا نہ ہو جائے کے ارادہ میں نے جانی کے لیے اپنے اپنے
 ہم نہ ہوں ہی کو منتخب کیا تھا حق یہ تھا کہ بیٹے والوں میں مسلمانوں کی اکثریت
 تھی اور بیٹے والوں میں ہندو مسلمان حکیم صاحب تھے لہذا ان کی بانی نہ سب
 سے کہیں، زیادہ ہو گئے سوال ایسا تھا کہ کوئی اور فریاد نہیں ہوئی تھی۔ بچارے
 جا بوش ہو رہے۔ اس ہنگامے کا ایک ضمنی نتیجہ یہ نکلا کہ اس واقعہ نے
 مرگ میں اپنے پڑوس کی مسجد میں باقاعدہ نماز پڑھنی شروع کر دی۔

عزیز کا ہندو عری کی شہرت ہوا تو غلام غزال اور کچھ بچے گیتے ہوئے تھے
 یہ واقعہ کہ ان کے ٹکے ساتھ چلی بیٹھی نے ملک کی حمایت میں جو حرکت کھیلی
 ان کی بہترین گیت حقیقت کی کا تھا:

ہوا و سس پڑوس چاہے کچھ کہے

میں تو صحیح رہے کو بھرتی کر آئی رہی

تو بہتے کہار بس اور پڑوس سے مراد کانگرس و دوسرا لیگ انھیں جو دوسری
 حمایت جنگ کے معاملے میں پہلے ہی نکال رہی تھیں۔

رنگ چلی کا ان کو کھیلنے کے لیے تھیکہ کے گرد ماحول کا جو مہم ہوا
 تو وہ محسوس کرنے لگے کہ شہرت ان کے لیے کافی نہیں اور انھیں دانشور کی کے
 میدان میں بھی جھڑپے کاٹنے کے چاہئیں۔ انھوں نے آزاد کوئی عنوان سے ایک
 نظم خاص میں ان کا راز کوئی کے منظر پہلے بیان کرنے کے بعد ان میں ان کو بڑی تھی۔

جس تک میری ملازمت کا ٹکڑا دنیا پر غالب ہے

مجھے تم سے بات کرنے سے جو آزادی کا طالب ہے

اپنے قصور و غلطی کی بنا پر وہ اس نظم و انضام کی تمکین ایک آدھار نظم و انضام
غالب ہے گا اور نہ یہ سمجھنا چاہئے کہ تمہیں اس مسئلہ میں کامیابی نصیب نہ
ہو سکتی ہوگی۔

دیکھ دو بار وہ دن جس میں میں نے وہاں پہنچا تھا۔ پھر نے اپنی نئی نظریں مجھے
سناٹا دیا وہاں میری شہری کے حالات دور دور تھے ان کی تشریح بھی فرماتے تھے۔ جلد
میں انھیں نے غصے میں کر کے کسی خانہ میں نہیں پھرتا ہوں۔ اس پر انھوں نے یہ کہہ کر کہ
اسی روز درجن ہزار غصے سے میرا رخسار لگا رہا تھا۔ میں نے حقیقتاً گستاخوں کی سی جی
سناٹے سے غصے سے دور ہو کر غصے سے دور کی تھی۔ میں نے ان کی بات کو نہ دیکھا
جو وہ وقت اور دن کی بات تھی کہ میری زندگی میں وہاں سے مجھے دور کی گئی تھی۔

اپنی اس بات کو نہ دیکھ کر کہ میں نے وہاں پہنچنے کی کوئی ضرورت نہیں
تھی۔ میں نے وہاں پہنچنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے وہاں پہنچنے کی کوئی ضرورت نہیں
میں نے وہاں پہنچنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے وہاں پہنچنے کی کوئی ضرورت نہیں
میں نے وہاں پہنچنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے وہاں پہنچنے کی کوئی ضرورت نہیں
میں نے وہاں پہنچنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے وہاں پہنچنے کی کوئی ضرورت نہیں
میں نے وہاں پہنچنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے وہاں پہنچنے کی کوئی ضرورت نہیں
میں نے وہاں پہنچنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے وہاں پہنچنے کی کوئی ضرورت نہیں

و انشوروی کا سلسلہ ختم ہو کر تو ہی پسند دل لے چکا تھا۔ کوئی بھی
کھیت کھیت کر ایک اس چیز کی راہ میں نہیں ہو سکتی تھی جو ان کے لئے نہ ہو سکتی تھی

ہے۔ میں نے وہاں پہنچنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے وہاں پہنچنے کی کوئی ضرورت نہیں
میں نے وہاں پہنچنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے وہاں پہنچنے کی کوئی ضرورت نہیں
میں نے وہاں پہنچنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے وہاں پہنچنے کی کوئی ضرورت نہیں
میں نے وہاں پہنچنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے وہاں پہنچنے کی کوئی ضرورت نہیں
میں نے وہاں پہنچنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے وہاں پہنچنے کی کوئی ضرورت نہیں
میں نے وہاں پہنچنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے وہاں پہنچنے کی کوئی ضرورت نہیں
میں نے وہاں پہنچنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے وہاں پہنچنے کی کوئی ضرورت نہیں

شاہی کی طرح عشق کے دعوای کے باوجود اپنی عام زندگی میں ترقی پسند
معاشرہ کی کاروتہ غزل کے دو اچھے عاشق سے چنداں مختلف نہیں تھا۔ یہ ہر دو بیچارہ
ہوئی کہ وہ کچھ کر لیں بھرے اور طبعاتی تھوڑی دہائی دیتے ہیں کہ باوجود ان کی ساری

حرفی پہاڑے عشق کی گنت چھینکے ہو تیار رہتے۔ اس قسم کے ایک عشق کا ذکر کبھی
سے خانی نہیں۔ یہ عشق سائرہ دوسری کو یہ ولولہ دیتا رکھتا اور ایک اور جوان شاعر
اشک کے میں ناپ چھوے۔ دونوں میں عشق کی ہو گیا کہ طوطہ بھی کے اصول پر کیا تھا
اور ان کے عشق کی ہر طرف کچھ ایک فارماں اہل شاعر و مستعار گئی کے پاس ان دونوں
ایک نچوٹا ہوا روزنامہ لکھنے کے لئے نئے نئے ناولوں سے تصور پر ہی کچھ لکھیں۔ سائرہ
کے پاس گھر و انہیں تھا لیکن انھوں نے اپنی پڑائی کے لیے ہر روز صبح نہاد کہ
شاعر کے زہریلے پوسٹی کی کھٹ بھر گئے۔ وہ اس کی نقول کے اردو میں نظم
ترجیہ کرتے۔ یہ مختلف جوائز میں انھیں عجیبو استہی کی نہیں بلکہ ان پر تعریفی نوٹ
بھی لکھواتے۔

شاعر کا دور پیر کا وقت نسبت فراغت کا تھا۔ یہ وہ دور کہ دھوپ میں
پیدا اس کی کوٹلی پر پہنچتے اور وہ یہ کچھ کر کہ غریب دھوپ میں چلا کر آتے ہیں۔
انھیں غریب چادر لگا یا اس کے پار کی کے دکھائی میں کہاں تھا کہ یہ اس غریب
کو شربت وصل کا دیا کچھ چھینے۔

اس شاعر نے نہ تو ہی کبھی ملا جلا اور نہ ہی نے اسے دیکھا ایسے لکھتے یہ
تینوں حضرات چ کر گئے کہ اپنا ایک جہد و راز والی کہتے تھے اور انھیں میرے
جس سماعت پر مجھڑ سنا اس لیے ہر دن گدا دوا دیکھ سنا تے رہتے تھے۔
وہ اپنے کی کو شش میں نے کبھی نہیں کی کہ ان کی داستان میں حقیقت اور اس نے
کا سزا کس نہایت ہے اور یہ کہاں بھی گئے حاصل ہے کہ میرے جیسے کا کیفیات
تے کو ان داستان کو یہ اندازہ شکل ہی سے نکال سکتا ہے کہ میں اس کی بات کو کس

نک وادگر رہا ہوں۔

اس داستان میں غلط بھی ہو گا تھا۔ انھوں میں جب ہر ماہر یہ لکھتے
کی زبان سے جان بھی نہ تھی۔ یہ دونوں مستعار تھی سے کہیں یہ وہ دانا تھے اور مستعار
کی نسبت میں وہ میرے وقت شاعر کی کوٹلی پر جانے کے بعد وہ رات رات صبح کو کھلی
کا لوان بھی کیا کرتے تھے۔

ان حالات میں دونوں میں یہ کی کہ وہ نامور میں نہیں تھے اور یہ ایک ایسے
ہفت روزہ اخبار میں کام کرتے تھا جہاں میرے کوئی مصنف اور قات کار نہیں تھے۔
صرف اپنی ذمہ داری کچھ پر تھی کہ ہر روز وقت پر وقت ہو جیسے، جہاں غرضت ہی
فرغت تھی۔ کچھ کہیں ہونی نہیں تھا کہ میں اور محلات فرغت کو دلچسپ تھا
کا اس سے زیادہ اچھا غرضت اور کیا ہو سکتا کہ کسی کی داستان میں سخن سنانے
اشکات ان دونوں دنوں میں نہ ہوتے تھے اور سائرہ کا بیشتر دن کام

وہی گزرتا تھا جب کافی شام میں چلتی سائرہ اور اشک کہیں چلے۔ چلا اور گئی
بگائے میں اس دور میں اشک کے کہے ہوئے سونا رہتا۔ صبح آکر وہ مجھے مل گئے
اور ہمارے دھوئے اور نہایت سے فارما ہوئے ہی ہی داستان شاعرانہ تر تھے
عجیب بات یہ تھی کہ ایک ایک دو فورڈی مجھے یہ پیش دہانے کی کو شش کرتے
کہ وہ عشق کا سوا ایک دیا کہ دوسرے کو چارے میں اگر وہ دانی باز نہ ہو تے
میری پیادہ اس کی گزیر بارہی قسمت تھی کچھ کہیں مجھے یہ سنا ہی کہ تھا کہ
سائرہ میں مقولے پر عمل کر رہا ہے کہ حصول شربت کا اصول یہ ہے کہ اپنے شغل
جتنی غلط نہیں چھوڑ سکتے ہو چھوڑا دو۔

ایک دن اُسکی بھوت چلا اس وقت تک ساکر جب اخبار سامنے آیا
شورش کا شہری کے کرتے میں منتقل ہو چکے تھے۔ شورش آخر خود وہاں موجود نہیں
رہے تھے۔ اس نے نفل میں ہم جاتی تھی اس دن میں وہاں پہنچا تو سنا کہ جی اندر
درازات کا عرصہ بڑی طرح بوس رہے تھے جس سے وہ وقت کا سہارا نہ کر سکی
غریبوں کی محبت کا مذاق اڑا اُن کا خیریت پر اچھا تو بند چلا گیا جب یہ لوگ وہاں
پہنچے تو شاعر ہونے کی تصویر پر کھینچنے میں آپ حضرات کی بڑی اہمیت ہوئی
میں ان کی قیمت تو مجھ سے ملے گی مجھے اُن کی اہمیت بھی مر دیا تھا۔

دانشور کے دل سے قریبی شخص عرو اور انہیں اس کے انائی کشین
اس طرح بھی ہوتی تھی کہ میں سے بیشتر کے زیادہ نصیب نہ تھے انہیں تھے اور جلد معلوم
تک میں ہر دورہ حمل کیے بغیر دانشوری کا دعویٰ نہ کر سکتے تھے وہ ان کی رہنمائی
تو تھی ہی نہیں اور اگر تھی کہی تو اسے نامہ ان تمام تعلیم یافتہ نوجوانوں کو کیا منٹ
پار دینے دانشور کا مقصد دیا تو ان کی دھجیاں کھل گئیں اور چند اُردو افسانہ مند کی
کے تحت وہ اس بڑی کی مراد اسنے پر آنا دے ہو گئے

محبوب بات ہے کہ اخبار کے انھیں جنم قریب وہ عرصہ پر انہیں عرو اور ان
معاذ اللہ کی کا دعویٰ کیا اور دانشور کے سب سے قریبی نے خوش
طبعی ہادی میں کی تقسیم میں رہی تھی میں دونوں تو شاعرانہ نام کھینچنے میں مدد دے
واقعی بڑا دلچسپ نہ گئے۔ سب سے قیام کے دور میں وہ آخر سے بھی تھے۔ بات پر ان
سے دینی ملاقات کا حال بتاتے ہوئے کہنے لگے۔ جو شخص صاحب کو تے ہو چکے
تھے کہ اُنھا نسبت کی تصویر کی کیا ہے۔ میرے اس مستعار پر کہ اس اُنہالی اور

تصویری کو معلوم کر کے آپ کیا میں گئے انھوں نے بے غلطی سے کہا کہ میں اسے
تکلم کرنا چاہتا ہوں۔

نومبر ۱۹۶۶ء میں انڈین فیلڈ فوج آف بھارت کے زیرِ اہم نامہ میں ان کی شخصیت
اور فوج میں ان کی کوریٹ میں وقت تک جنگ میں سرگرمیوں کے خلاف تھے اور جنگ
کو سارا جی جڑ کر خور و رہے تھے۔ کا اگر اس کے دینے کے پیش نظر احوال ان
کے لیے برا نکلا تھا۔ انھوں نے سوچا کہ اس سارا گاری سے ناکہ اٹھا کر اپنے
نقد رانی و قبول سے اتفاق م نہایا جائے۔ ان فوج کی مہارت کے لیے اسم۔ احمد
راے خود کٹر لڑنے والے تھے۔ جیسے ہی ہم لوگ انھیں لے کر ونگ دوم سے
باہر نکلا لیٹ فارم پر ہی کیونستوں کا سامنا ہو گیا اور کافی جھڑپاں لڑیں وہ باہر
کے غریبے لگا سب تھے ان کے قہر نہایت تھے کہ مظلوم عدم تشدد کے اصولوں
کے مطابق لڑے نہیں ہو گا کیونست اس کے کہ ان کی طرف سے کوئی غلطی لازم ہوتا
ہو تو اسے ایک سا کھانے والا کو ایک کیونست کی تاک پر مہم جوہ و باہر دہلیوں نے
حق وفاق سے لوکی تو کیونست اس معاملے میں چل گئے کہ ہم نے ان کا مظلوم کر کے
پوری چوری تیار کر رکھی ہے اور یہ حال خوف ہے کہ اس خاتم ہر جہاں ہادی
اس میں ہادیوں کا لڑا بھی خزاں موعز گشت کی ہادی کیونست ہٹ گئے۔ انھیں
پیدا موعز عقائد ہادی اور ہر سب سے سیلان ان کیونستوں کو شکست
دینی تھی۔

لیٹ فارم پر کیونستوں کو شکست دینی تو لیٹ کے کشتیوں کے باہر بھی

اسی مسئلہ پر تمام سب تو اس کی وجہ ان میرٹوں کی مصلحت کو ملحوظ رکھیں
 زائد و آج کہ جہاں ہم لوگوں نے ان سے مسواید شاہ پر گفتگو کی وہاں نام کی صدا
 کے واسطے ان سے بچنے کے سبب سے کچھ فٹ ان کے ساتھ رہنمائی سے چلی آئے۔
 کافر خوس کے بعد مجھے اندر ہی اندر دفعتاً اندر میری پیاب خان کی درگاہ
 کیٹی کا میری یہ گریہ اس کو اندر تو جس کے دل میں یہ تھا اور اس کے بغیر جب کہ
 مجھ کو جس کے بغیر میری تھی۔ یہ مجھ کو میری گاہ کی حالت میں یہ اندر میں آفسیر
 بھی چلنے لگے۔ ان سے وہ ان کی مافی اعلیٰ جہاں ہندوؤں کو چھوڑا اور وہی گریہ
 سر کو پیوستہ جس سے چلنے کو نہ صرف چلے۔ اندر میں کا مقررہ و آج تھا
 و ان ہندوؤں کے ہندو حقوق منانے میں بھی سرگرمیوں میں تھی اس سے ہندوؤں
 کو بہت ڈان سے پہلے۔ صرف یہ نہیں کہ ان کی توجہ ہوساں مسئلہ ہوئے اور
 اعلیٰ برطانوی حکومت نے کہ ان کے لیے سستہ راج کی دکان پر بھی کھول دی گئی۔
 چنانچہ وہ تمام لڑائی کی زد سے بچ کر اس کے تھوڑے پڑے چکے تھے۔

ہندوؤں کی حالت سدھری اور ان کی حبیب میں پیسہ یا توڑ پھوٹوں
 کی قسمت بھی ہو گئے تھے۔ اس کی مقبولیت اور اقتدار میں اضافہ نہیں ہوا جبکہ
 بالی حالت بھی پہلے سے کافی سدھری۔ دگریت میں اضافے کے ساتھ ساتھ چہرے
 بھی آسانی سے وصول ہونے لگے۔ یوں کے آٹھ کی زد سے چند سے کاشی فیصدی
 حصہ وصول کنندگان کو ملتا تھا اور اس کا صرف میرا فیصدی حصہ یوں کے ذخیرہ
 پر تھا۔ مختلف شہر و ہرگز یوں کے پیشروں نے انہیں ہاں رکھے تھے
 اور چند سے کی وصولی کے لیے اخراجات سفر بھی تھیں خود یکا بداشت کرنے

ہوتے تھے۔ جن دنوں یوں کی کچھ زیادہ مقبول نہیں تھی اور چند سے کہ اب تھے
 وصول کنندگان کے اتنی فیصدی تھے کہ ان کو ان کی حبیب میں ہاں کے نام پر
 رقم پہنچتی تھی اور بے ہار سے تنگ ہستی سے لڑتے تھے۔ اب چند سے وافر
 تھے لگے تو ان کی حبیب خوب گرم رہنے لگی۔ ایک ایک چکر میں ہندو ہزار ہزار
 ٹوڑے ہزار رقم وصول کرتے اور اس کا اتنی فیصدی ان کی حبیب میں رہتا۔
 پیاب باہلی کے اتالیقیوں میں ایک حلقہ ہار تھ و سیرت و غیرہ کے
 مزادوں کا بھی تھا۔ یہ بھی یوں کے پیشروں کے لیے آمدنی کا ذریعہ تھا۔
 جب بھی انتخاب ہرگز اس سبب کہ اس کا امیدوار کو کوئی بچہ ان میں
 سے بھی کسی فرد کو رکھتے۔ بچے کی ایک مرتبہ کی ایسی ہی صورت کی کامیابی کے بعد یہ
 لوگ ہار لگتے تھے۔ ہار کو ہار لگتے تھے۔ ہار سے انہیں بھی کوئی بچہ نہ
 نہیں ہوا۔ اب یہ کوئی بچہ ہاں یا اب اس رقم آپ کو پہنچائی گئی۔ اور کچھ کاشی کی پیشہ
 تھیں۔ اس لیے کاغذ ٹوڑ پھوٹوں میں ہار لگتے تھے۔ ہار لگتے تھے۔
 سبب سے اس کا کاغذ ٹوڑ پھوٹوں میں ہار لگتے تھے۔ ہار لگتے تھے۔
 کرتے تھے۔ ان کے بچہ و دست نام۔ اس میں بھی وقتی سیاسی کارکنوں
 کے بچہ حبیب لگتے تھے۔ اور وہ سے بال طور پر اس سبب ہار لگتے تھے۔
 رکش کو ہار لگتے تھے۔ ہار لگتے تھے۔ ہار لگتے تھے۔ ہار لگتے تھے۔
 لوگ خرید و بند کا اختیار بھی چھیننے سے نہیں چھیننے لگے۔ لیکن یہی
 لوگ اپنے کاروبار و سیاست کو جاری رکھنے کے لیے معمولی سے معمولی کاروبار کے
 لیے اپنے اصولوں میں تو یہ تسلیم کرتے تھے۔ بعض سیاسی کارکنوں کو تو صرف

تھے۔ میرا خیال ہے کہ سارا کو چھوڑ کر چاہئے تھے۔ کیا خواہشات خود ادا کرتے تھے
باقی طالب علم کو سنسکرت کے خرچ پر مہربانی رہے تھے۔ بہر حال یہ واقعہ ہے کہ
یہ کیونسنسکرت کا اچھا خاصہ ادا تھا۔ سارا کو چھوڑ کر کالی آنا مانا تھا
اور کئی بار قرات بھی دہائی میر پر جاتی تھی۔ سارا کو اپنے دوستوں کے طور
طریق پسند نہیں تھے۔ دوران کی حرکتیں وہ منہ سے لے کر مجھے سنا دیا کرتے۔
ایک بار انھوں نے مجھ سے ایک کتاب کا ذکر کیا جس میں عمارت کے کتبیں ایک
کھرب کے پاس تھیں اور میں میں بنا دیا گیا تھا کہ کیونسنسکرت بننے کی دعوت کس
کس قسم کے لوگوں کو کس کس طرح دینی چاہیے۔ مجھے اس کتاب کو دیکھنے
کا اشتیاق تھا۔ پہلا میرا اور میں سارا کو چھوڑ کر مینوں میں لگا کر یہ انھوں نے مجھے
حاصل کر دی۔ میں نے کیونسنسکرت کے حق میں اور ان کے خلاف بہت کچھ فرمایا
جسے میں اس سے زیادہ گستاخ گھیر کتاب میری نظر سے کبھی نہیں گزری۔
کتاب میں نظر باقی مباحث ملنے نہیں تھے۔ صرف یہ بتا دیا تھا کہ مختلف
قسم کے لوگوں کی فکر و رویوں اور ان کے احساس غلبت خوردگی سے
کس طرح فائدہ اٹھا دیا جائے۔ بطریق کار و دی تھا جو ہر قسم پیشہ وریاں نمبر
بھرتی کرنے کے لیے اختیار کر لیں۔

بنیاد کیونسنسکرت پارٹی کے جنرل سیکریٹری اقبال سنگھ سے بھی میری ملاقات
سارا کو میری دوسرے ہوئی تھی اور سارا کو ایک رستوران میں بیٹھے تھے کہ وہ بھی
وہیں گئے۔ سارا کو نے میرا تعارف کرایا اور یہی کسی اس کی عادت تھی۔ میری
نہایت کی مبالغہ آمیز تعریف کی۔ اقبال سنگھ نے مجھے ہنس دیا۔ روزہ تولی جنگ

میں کھینے کی دعوت دی تو میں نے معذرت کی اور وہ بے نفعوں میں رہی
چا دیا کہ میں سیاسی طور پر کیونسنسکرت پارٹی سے متعلق نہیں ہوں۔ اس پر انھوں نے
مجھے جاوڑ خیال کی دعوت دی اور سارا کو میری یہ بھی کہا کہ اقبال کی تفصیل سے ہونی
چاہیے اور یہ کہ میں کیونسنسکرت پارٹی کے دفتر میں آسکتا ہوں۔ اقبال سنگھ نے سارا کو
اور دونوں کے ساتھ ہندوستان میں ایسے صرف اٹھ آدمی بھیج کر سنسکرت لکھنے کے
بہرہ طور پر بھیجے ہیں اور اقبال سنگھ ان میں سے ایک ہیں۔ بہر حال یہ ممکن نہیں
تھا کہ کوئی شخص اسے اور میرا فرار ہو جائوں۔ میں نے دوسرے دن کیونسنسکرت
پارٹی کے دفتر میں بیٹھنے کا وعدہ کر لیا۔

میں کہ اور یہ کہ چکا ہوں۔ میں کچھ روزہ نہیں بھارت میں کیونسنسکرت پارٹی
کا دفتر تھا۔ اس سے میں بخوبی واقف تھا۔ لیکن اس دن میں اور سارا کو وہاں پہنچے
تو لکھا کہ اور سارا کو وہاں سے چاکر دوں۔ لیکن کونکر کیا وہ کھانا سے پہنچا رہا ہے
تجربہ داکر بھی آیا۔ اقبال سنگھ نے سنسکرت پارٹی کے بلڈز پر سیکرٹری کیست اور سارا کو
کے لیے مسئلہ ہے۔ وہ وہاں کھانا اور ایک اور کام کرنا کو ضروری کہہ لیا۔ لیکن
اس وقت وہاں کی باؤری کی خوش کنی پر شک تھا۔ تاہم وہ مجھے اقبال سنگھ کے گھر
میں پہنچا۔ باؤری کے ساتھ کا حاصل کچھ پر شک تھا۔ اقبال سنگھ کے ساتھ وہی ڈھولیں
ہی ملوئیں۔ اقبال سنگھ کی حکومت سے کو بہوں میں کاہن بنے بیٹھے تھے۔
ان کے گھر سے ہر دانش جلال تھا۔ وہ اس اقبال سنگھ سے کافی اختلاف نظر کرتے
تھے جس سے کہ سارا کو روزہ سوار میں میری ملاقات ہوئی تھی۔ اور سارا کو ہر کی بات
بدا انھوں نے مجھ سے اپنے خلاف بیان کرنے کو کہا تو میں نے اپنا ایسا بیان سے کی

کہ ان میں نے تاریخی حوالے کے متعلق جو پیشگوئیاں کی تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں۔
اس صورت میں یہ کیسے یقین کرنا جا سکتا ہے کہ اس شخص کے لپیٹے کئی ہونگے؟
بھروسہ سوڈنٹ غارہ پانسی یہ کچھ بہت خردداشت کیا، مونا قریل سنگھ اسے بعض
مراحبہ میں غبار میں لٹا آپ کا اختلاف ہمارے ساتھ ہے لیکن آپ کا اختلاف
تو یہ تھا تو ہی کیونست غریب کے ساتھ ہے۔ اس صورت میں آپ سے کوئی
بات نہیں چرکتی میں بھلا تو کر کے اس سے کھلا آیا لیکن اچھلے اچھلے اس
طریقہ پر آکر یہ ہندوستانی کوئسٹ پارٹی کے دور کو تسلیم ہی نہیں کرتے تو
اس سے اختلاف کیا کہیں باور کر کے ان طرفی گناہ بار بار اگر وہ کچھ سے خوف
نہیں ہوئے بلکہ قریل سنگھ کا مذاق یہ بھلائے ہے۔

مراحدوگ ہائے دہلی میں اندر کیونست پارٹی سے ان کی پیشگی
کئی غورنگی ملے پر ہی غلطی بتھری کیونست میں میرے ساتھ وہ کبھی نہیں اچھے گورجسٹ
رہنے کسی کیونست کو۔ تاہم یہ دیکھتے تو یکے دوسرے میں سترت بھی غورسٹ
کرتے۔ بعد میں بخارہ کہتے۔ میں اس سب آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن کوئی تہوار
اور بھاری پارٹی کے ساتھ نہیں آئے؟ جب اسے پاس ہے ہی کیا؟ کیونست
میں جو یہ کام لیتے ہیں وہ بہت شہرت کی طرف سے پہنچا دیتے ہیں۔ یہ ان کی دلچسپی
تھی کہ کچھ سے ان کی دوستی بہر حال قائم رہی۔ غورسٹ نے میرے خلاف دشمنانہ طریقہ
میں شرکت نہیں کی اور میں خود اپنے کام پر دوسرے پاس میں ان غورسٹ ہی کرتے
ہے۔ یہ وہ غورسٹ چاہتے تھے کہ میرا دوست پرانوں کا کہہ رہے تھے۔ کیونست
کہتے ہیں، ایک بار اپنے دوست سے تم نے کہا اور دیکھو مجھے ہم اسے کس جگہ پر

ے جاتے ہیں لیکن نہ میں نے ہاں کہا نہ دیگر دوستوں نے کچھ جلدی پر پہنچانے
کا جس کی کیا۔

محبت بات ہوئے کہ لوگ مجھے اس کیونست کہتے ہیں ان کے یہی میں
کی دور ہوتا ہے۔ دور یہ کل ڈیڑھ کر رنگ پارٹی سے میری وابستگی کو کیونست
پارٹی سے وابستگی سمجھتے ہیں۔۔۔ ان کا غورسٹ ہے کہ جس اختلاف۔ یہ لیکن
ڈیڑھ کر رنگ پارٹی اور کیونست پارٹی میں اختلاف اس سے زیادہ کاغذ میں دو سیاسی
پارٹیز میں کیا کیا نہیں جا سکتا حیرت کچھ یوں نہیں ہوتی کہ وہ اپنی صورتوں میں
ان دونوں میں اس سلسلے میں غورسٹ میں بہت غلط فہمی موجود تھی۔ ساتھ کہتے تھے کہ ایک
مرتبہ جناب میں انجمن ترقی پسند مسیحیوں کو قریل سنگھ کے اس اندر غورسٹ پر غورسٹ پر غورسٹ نے
ایک ہائے کیونست لیڈر کو غورسٹ دیا کہ یہ کام پانچوں کر سکتا ہے۔ اس پر اس
نیز نے کہا: اس کی صلاحیتوں سے انکار نہیں کیوں وہ دشمن کے گپ میں ہے۔

تاہم ڈیڑھ دن میں سے میرے ذریعے کے لیڈروں میں ایک مراحبہ خواہ غورسٹ
میں تھے چھ لیڈروں کی اسٹی فیصلہ کی تھی جو ان میں کاہنہ، وصول کرنے کا ٹھیکہ
ظاہر تھا ان میں سے ایک مثال تھے۔ ان میں لیڈر لیڈر آف سیر پانچ ہونے لگا تھا ایک
اختیار کھلنے کی وجہ سے اخبار کا نام مزدور کی آواز تھا اور یہ ان میں لیڈر لیڈر
آف لیڈر اور لیڈر کل ڈیڑھ کر رنگ پارٹی اور غورسٹ ہی کی پانچوں کا حال تھا۔ غورسٹ کی
بیشک پارٹی لیڈر کی حیرت سے ان کا نام جانا تھا لیکن اس میں کیا چھپتا ہے اور
کیونست اس سے انھوں نے کچھ فرق نہیں دیکھی۔ جلد ادارتی غورسٹ میں یہ ہوتا تھے

وہ مجھے اس کا ملو عز دیتے تھے اس لیے اس وقت وہ آج بھی اس میں ان کا طبع
 لیکن انھوں نے بہت سے ساتھ آجروں کو اس کو بھی نہیں کیا بلکہ اسے اٹھا کر اور بڑا
 سے بڑا آستہ کر دیکھنے والے کو یہ گمان گذرے ہے جسے میں ان کا نہیں بلکہ وہ میرے
 حاکم ہیں لیکن بلاخوشی نے یہ بھی کہا کہ میں اخبار پانچ نام بھی دے دیا کروں گا
 میں سے نام نہ ہی رہا اس پر پانچویں نام میں اس بات کو خاکا کہ اسے ساتھ
 اپنے نام دیا جائے مگر میں نے اس بات سے یہ کہنا کہ وہ اپنے نام میں بہت جری
 زبانی ہوئی۔ ویسے ان کا نام اخبار کے لیے طبع بھی تھا لیکن کے چندوں کے
 وصولی کے سلسلے میں وہ زور و زور یک دوسرے کرتے تھے انہیں وہ دونوں سے
 اخبار کی نوعیت میں عورتی تھی۔

جیسے اگر وہ رکھا ہوا تھا ہے ان دونوں باقی سب کی طرح اخبار نویسن
 کی خبر سے بھی چڑھتی تھی لیکن کسی بھی اخبار میں معقولیہ طور پر فزمرت لی سکتی
 تھی لیکن اس اخبار کی کشش ایسی تھی کہ جب تک وہ بند نہیں ہوا میں نے اسے
 نہیں چھوڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس میں مجھے اخبارات کا موقع ملتا تھا جنگ
 کی نایت کی وجہ سے ہم لوگ خبروں کی نگاہ کر دیتے تھے کوئی اخبار یا مجرہ ایسا
 نہیں تھا جس میں یہ نہ ہو کہ وہ معقولیہ طور پر اسکا میں میں میرے ہی خیالات
 کا اظہار ہو جو یہاں قدر ہے۔ نے ایک ایسا اخبار مرتب کر دیا تھا جو کہ اسے ہی
 خیالات کے لیے وقف تھا وہ واقعہ ہے کہ جتنی لیکن، تندی اور سرشارگی سے میں
 نے اس اخبار میں کام کیا اتنا میں نے کسی اخبار کے لیے نہیں کیا ہے میں مجھے اپنی
 محنت کا فائدہ حاصل تھا مگر میں نے بہت سی ہی محنت حاصل کی ہوئی تھی لیکن

میں بلاخبر کے صفحات تنگ دانی کا شکر کرنے لگتے تھے۔ اور میں مضامین
 کے علاوہ اخبار میں ریڈیو کیلئے ٹیکر کراؤنگ پارٹی کے ترانے روزنامہ الہیہ پرنٹ
 انڈیا میں شائع شدہ مضامین بالخصوص مرحوم ایم۔ این۔ رائے کے مضامین
 کا ترجمہ بھی ہوتا تھا۔ ترجمہ شروع شروع میں میں خود کرتا رہا لیکن بعد میں اس
 سہولت میں ساتھ لکھی گئی بھی میرا ہاتھ بٹنے لگے۔ میرے مجھے کافی سہولت
 ملی کبھی کبھی ساتھ اس کے لیے ڈکٹا ہی کا کام بھی لکھ دیا کرتے تھے۔ ایک بار اس
 کا کام میں انھوں نے اپنے جو ہر دور میں ہمد و ستائش میں لطیفی کا مذاق اڑایا
 لطیفی صاحب ایک تو نیم ہی اور ایک ان کی محنت خراب ہے۔ بے چارے
 بڑے ہی جڑ بڑا اور بد نام ہے۔ ساتھ سے لکھانے میں ملے تو اس نے
 بلا تکلف میرا نام لے دیا۔

ایک بار پانچویں دن سے ملنے کا تو ایم جی جی لطیفی تو تنہا ہی احتجاج کے لیے
 اٹھ کر رہے ہوئے تھے اور اس کی پاداش میں جیل گئے تھے۔ انھیں گمان نہ تھا
 کہ مسلمان اگر یہاں پر جیل میں شرکت کی پاداش میں دیگر نروں کا کچھ نہیں بلکہ
 سکے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ وہ ان کے ساتھ گزراؤں میں اس کا کچھ نہ لکھو
 سکیں۔ چنانچہ انھوں نے میرے خلاف ایک جلسہ کر دیا جس میں اپنے بھائی
 کا رہنے کی یاد دہا کر لکھانے کے مسلمانوں کو اس ناچیز کے خلاف کوئی کوثر
 کار نہ الی کرنے کا مشورہ دیا۔

کرنا تھا کہ یہ ہوا کہ جب ان کی تقریر جاری تھی تو جلسہ عام سے کچھ ہی ناخن
 پر کسی نے میرا نا شروع کر دیا اور شرکائے جلسہ تقریر پر اجتماع سے ہٹنے

میں کھڑے ہوئے ہیں جس کچھ دخل سے معافی مسلمان دوستوں کو بھی تھا اور انسانی
مہربانی کو جس کی روایات کا احراز نہ تھا چاہتے تھے۔ ساتھ ساتھ بد مذہب کے بتا
کر اس جتنے کا احترام کرنے کے لیے بعضی مہربانی کے لیے ایثار سے کام لیا تھا۔
گندہ کی راضی کہنے رقم بھوننے اس طرح فراہم کی کہ اپنے مکان کی
بروزی دیوار کا کچھ حصہ تھر تھر اس کی ایشیوں پر خدمت کر دیا۔

”مزدور کی آواز“ کو اکثر یہ فیئر و فیض آتے ہیں اور وہ ٹیگڈ ہیکر ٹیگڈ پانی
کی سرگرم حرارت واصل تھی۔ وہ ہزاروں قریب کا پانی فیئر و فیض کا مصدر و دفتر
فریاد تھا جو فیئر و فیض کی اشدت مناخوں کو سمجھتا ہے اور فیضی خواہہ کدو
اپنے دروازوں پر جو فریاد جلتے تھے۔ سمجھتا ہے کہ یہ وہاں کے کوئی بھی اس سے
بچھڑا یا بھاتا اس طرح کی طرح شانت و دہرہ ہی رہتی تھی۔ لیکن لاف کا کوئی
چاہہ ہزاروں گائیوں کے لیے ماضی تھا۔ اپنی ماٹھ کا لاف خواہہ کدو سمجھتا ہے۔
فریاد کر دیتے تھے۔

ان دونوں پر ہزاروں کا کے خلاف چار ہزار محبوب فلاں ہزاروں میں چار
کے سلسلے میں ہم اپنے عزیز و اقارب کو بھی نہیں پہنچتے تھے۔ مہربانی کی فریاد کا لاف
لوگ تھے۔ میں انہیں بھی جانتا تھا کہ ان کے ہاں میں چار ہزاروں تھے۔ لیکن خواہہ کدو
کی اس حرکت کے خلاف کہ وہ کوئی خلاف کا لاف ٹیگڈ ہیکر و فیض کر دیتے تھے
میں نے کبھی احتجاج نہیں کیا۔ بیشتر یہ نہیں کی کہ ان دونوں اس سلسلے میں
میں کوئی جملہ تھا کہ ایک شخص کے حصول کے لیے غلامی و راضی بھی استدلال کے
جانتے ہیں مگر جتنا بچھے تو سرکاری کا یہ عام تھا کہ اس طرح کی کوئی ہزاروں کی

طرف ذہن نہ رہا کہ وہ نہیں تھا۔ انی بات اپنے حق میں لیتا کہ ہرگز اپنے
اس غلام کا کوئی خواہہ نہیں کوئی کسے کا کا لاف ٹیگڈ ہیکر میں چاہتے ہیں اس نے لاف
اٹھانے کی کبھی کو شمش نہیں کی۔ نہ کبھی اس میں جتنے کا لاف ٹیگڈ ہیکر اور نہ کبھی
یہ کہ لاف ٹیگڈ ہیکر خواہہ ہر ہزار کی جلتے۔ دراصل یہ کہنے کا علم اس شخص نے اپنے
آج کا کہہ اپنے اپنا ان کا کہہ تھا اور لاف نہ خواہہ کدو سمجھتا ہے۔ یہ کہنے
اس احساس پر تھی کہ کوئی نہ نہیں چاہتا تھا۔

وہ ٹیگڈ ہیکر ٹیگڈ ہیکر کے لفظ سے سخت ذہنی اور جذباتی و ابھلی
کے اور وہی جانتی طور پر اس کی سرگرمیوں میں خالی نہیں تھا۔ اس کی ایک جہ
از سب سے لاف ٹیگڈ ہیکر کے لفظ سے سخت ذہنی اور جذباتی و ابھلی
لیکن کچھ دور باج رہی تھیں جنہوں نے جانتی طور پر کہے الگ ہی رکھا۔ وہ ٹیگڈ
پانی میں مقصد واد حشیت جیتے ایسے وہاں کو ماضی تھی جس پانی میں شانی
چونے سے پہلے کہ نہ تھے جنہوں نے لفظ پانی سے پرکھتے کبھی کوئی کہہ
خیر واد کہہ رہا تھا اور جیتے کو اپنا جہ واد کہہ رہا تھا۔ لیکن ماضی
میں ان کا روتہ پر مشد کھیت کینا اور وہاں خاد خاد خاد خاد کی شانت کے
راکھیں میں پانچ کہہ ایسے تھے جو لاف واد حشیت حاصل کرنے کے اندر واد
تھے۔ ان سب نے ہر کوئی کی تقسیم کے سب سے ہر کوئی کو الگ الگ خوں پر اپنی تعریف
اور اپنے وقتا لموں کی دست لگی جنرل سیر بری نے ان پانچوں کو ان کے خوں
نہ تو اب دیا اور ان پانچوں خوں کا ماضیوں ایک ہی تھا یعنی یہ کہ مکتوب نگار واد
شخص ہے جو لاف واد خوں کا ماضی ہے اور اس کے پانی رقیب واد خوں

کو دیکھا۔ جن کی سب سے بڑی صاحب کے ساتھ زبانی بیرونی گمان کی بات
پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ان کی برتری کے لیے ایک کتاب میں نے ان کا
اپنے دوستوں کے ساتھ کیا جس پر انھوں نے بھی اپنے خطوں کے سامنے
دیکھ لیے۔

وہ ایک اور بزرگ کا نام ایک نئی پارٹی کی حیثیت سے خجانب میں کیم کا خیمہ
کے ساتھ دیکھا۔ کیم کا خیمہ اور چیلے افراد کی تائید و ترمیم حاصل ہے۔ تنظیم
معارف میں بہت زیادہ ناکامی ہوئی تھی۔ ان کے بعض جنوں میں اضافہ ہوا اور
اپنا سامان اختیار کیا۔ دوسرے ہاتھ پر بعض بھی تھیں۔ پارٹی کی ناکامی میں
اس کا نہیں بلکہ دوسرا فائدہ ہے۔ اگر کوئی شخص کام کرنا تو ان کے تہذیب کا ہدف
نظر میں رکھتا ہے۔ ان کے اندر اور دیکھ کر دیکھ کر پارٹی کے ہدف سے
کے لیے ایک ایسی کامیابی تیار کیا تھا۔ مقامی مقامی جماعتوں کو اس کا اردو
ترجمہ شائع ہو جائے۔ لیکن وہاں سے محروم تھی۔ میرے قلمی ترجمہ میں کو اس پر
آباد کیا کہ وہ اس کا ترجمہ اپنے حقوق پر شائع کر دیں۔ وہ وہاں سے چلے گئے۔
وہ امر ہے کہ جیسے کامیابی سے مواضع میں ہوا۔ ترجمہ شائع ہوا تھا کہ میں اپنے ساتھیوں
کی تہذیب کا ہدف میں تھا کہ میرے پارٹی کے کاموں کو دیکھ کر وہاں مسئلہ بالکل
ہے۔ میرے دیکھنا تھا کہ میرے اپنے کی کچھ تھا۔ ایف کا اردو میں ترجمہ
شائع کر دیں۔ ایک دوسرے ترجمہ اردو کی طرف سے شائع ہوا بھی نہیں
ہوا۔ اس میں نے بھی کامیابی میں نہیں ہوئے۔ مجھے ترجمہ کا جو مواد تھا
وہ مختصر، اگر تھا۔ اس میں اس قسم کی کوششوں سے دست کش ہو گیا اور

ایک مضمون کیم جو میرے ساتھ نہیں ہوا۔ میرے ساتھیوں نے یہ سب کچھ اس وقت
کیا۔ جب پارٹی کا ترجمہ کرنا زیادہ مقبول نہیں تھا۔ اولتے خائف کرنا اچھا خاصا
ایسا تھا۔ انہیں جوش میں جوش کی گواہی مل رہی تھی۔

جوش کا ساتھیوں میں یہ عالم تھا کہ ایک کامیابی کے متعلق مضمون تھا کہ اگر
رستہ میں میرے پاس تھے۔ ان کا اردو و سرکاری نوٹوں پر لکھا تھا۔ ان کی بات
چشموں میں ہو سکتے تھے۔ ان کا خاکہ لکھ گئے۔ لیکن یہ لوگ بڑے نہیں تھے۔
لوگ اپنے اپنے کاموں سے کام لے رہے تھے۔ ان کے کاموں کے کاموں نے
میں نے تقابلی کو ان کے حوصلوں کو اپنی سبب سے دیکھ کر غصہ کیا۔ وہ کام بھی کرتے
اور یہ سب کاموں نے ایک ہیے دور میں کیا جب ہر حق صرف کھڑے ہیں کہ
داخلی مہمکت میں سکنا تھا۔

عالم ہونے کے بعد انہیں کا دوسرا نوٹ لکھ کر دیکھا۔ یہاں انہیں دوسرے
کی مختلف نوٹوں کی بات ہے۔ ان کی مہم سے مسلمانوں کے لیے شروع شروع میں
پہلی آئندہ ان میں زیادہ تر وہ مہم سے مسلمانوں کے لیے تھیں۔ لیکن پھر مسلم لیگ کی آئندہ
تھے اور اس طرح ان کا کام یہی تھا۔ ان کا نوٹ بھی ان کے لیے تھا۔ یہ اس
وقت کی وجہ سے تھا کہ اس وقت حزب جوش کی مجلس کے سربراہی میں
میں چلے گئے۔ ان کے جلسے کی مجلس میں وہ مہم جو تھی۔ وہاں سے ان کے گھر گئے
بیکری میں تھے۔

ایک ایک چھپنے حزب جوش کے قیام میں رہتے تھے۔ پارٹی انارکالی

والوں میں ایک عہدہ بن گئے اور ایک سلاطین عہدہ بن گئے اور ایسی جو
پنج خواتین تھے اور لوہے کی سیڑھیوں گرم رکھنے کا ایک جہاز
تھی سیاست میں انھوں نے ہر کوئی کی سیر کی گئی قیام نہیں کیا اور
عہدہ ایک خوش شکل لڑکیوں تھا کیونست پارٹی سے وابستہ تھا اور پارٹی کے
ایسا ہی مسلم لیگ میں شامل ہو گیا تھا۔ احراریوں نے اسے دلبریت کا خطاب
دے رکھا تھا۔

لاہور کا شاہی کوئی سب سے گروپ ہر گز کوئی نہ کوئی کاغذ نگین
بیکری کی کھل میں موجود ہوتا ہر جماعت اسلامی کی نمائندگی ایک صاحب
فرشتی کرتے تھے انھیں یہ بات کسی قدر ناگوار گزرتی تھی کہ میں ہندو ہونے کے
باوجود مسلمانوں کی سیاسی جماعت میں سرگرم حصہ لیتا ہوں انھیں چاہئے کہ بے
عائق میں جانوی کہہ کرتے تھے مگر یہی مسلمان ہے۔ اس سے کیوں
جھگڑتے ہو؟

ایک بار جماعت لاہور کے مخالف حصول پاکستان کے بعد اس ملک کا
سیاسی نظام کیا ہو گا اور یہ کہ ہندوؤں کو اس نظام میں کیا وجہ دیا جائے گا مسلم
گروہ کی جمہوری نظام کے حامی تھے جس میں ہندوؤں کو ووٹ کے مساوی حق
مائل ہوں اور ہر فرشتی ہندوؤں کے حق کی نسبت سرگرم تر حمایت کے باوجود
جماعت ووٹ لاٹھ دینے کے لیے تیار نہیں تھے اور انھیں ذاتی جان کر لکھ دیا جاتے
تھے۔ ہادی علیگ کو شرارت شومہ اور فرشتی کو میرے خلاف ہونے والے کے
لیے کہنے کے بعد اٹھل کیا ذاتی بنے گا یہی تھا کہ ہمارا ہر بات میں دخل دیتا

ہے لڑائی ہے چارے اس قسم کے واقعات کو گرا بھینے واقعی مجھ پر برس پڑے
اور فرشتی صاحبہ کو دیکھ کر اس کا دم اس جہد کو پاکستان میں نہیں رہنے دیا اپنے
گھلا دیہاں تک دھکی دیا کہ اس کا سرخیز ہر دم کرطوس نکالا جائے گا گینگ
بیکری کے ختم ہونے کے طرف کا یہ عالم تھا کہ دھکی بالکل ہی اکارت گئی۔ نہ
میں نے تو بے انتہا رکھی اور نہ کسی اور کا سکون پر ہم ہمارے ہادی علیگ اپنی
خینیاں مسکلاہٹ بھینے سے اور فرشتی ان کی شرارتیں نفس کا یہ
عالم تھا کہ جب لاہور کا سکون واقعی برہم ہوا اور ہندو اکثریتی فرشتے کے
کاغذ بنے تو مسلمان دوست مدد کو میرے گھر سے پہلے پہنچا اور فرشتی
ایک تھے۔

مولانا صلاح الدین صاحب کی صحت میں اگرچہ خرابی نہیں ہونے لگی تھی
اور انھیں گھر میں خرابی ضرور ہوتے تھے انھیں سب سے زیادہ تشویش اردو
سے مستقبل کے بارے میں تھی شروع شروع میں ان کا خیال تھا کہ تقسیم ملک سے
اردو کو ناقابل ذاتی نقصان پہنچے گا۔ لیکن پھر وہ محسوس کرنے لگے کہ تقسیم ہندو
کی تلاش کے لیے ایک افراطی ہے۔ جب اہل زبان پنجاب کی تہذیب کے توجہ پر
کہ صفت کے ساتھ دیکھنا چاہیں گے اور اردو کو فروغ حاصل ہو گا۔ ملک
تقسیم ہوا، لاہور چلنے لگا اور مسلمانوں کے لئے ہونے والے وہاں پہنچنے لگے
لیکن وہ وہاں کی گفتگو کا انداز ایک ہی رہا: پنجاب میں اردو کا کیا ہے گا؟

اس قسم کی باتیں کر شروع شروع میں ان پر شفا دینے والی لگتی تھیں مگر
تھا۔ ایک ایسے وقت میں جب سدا کے منتقل ہوا ہوا تھا تو انھیں اندیشہ

سے اٹھ بے پردا ہو جائے گا۔ دو کے مستقبل کے سوا اور کچھ سرتجے ہی نہیں رہ سکتا۔ ستم ہائے ستم پر گم ہونے کے چہرے پر ہر وقت سکراہٹ کھینچی رہی ہوگی اور غم یا غصے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔

ہندوؤں کو ہمارے جانتے بچا کر بھی، انہوں نے صرف یہی کہہ دیا: نقل صاحب یہ لوگ آخر کون ہیں؟ رہے ہیں یا نہیں؟ ہمارے لیے اور کبھی لیبیب سا لگا سکیں گی؟ ستم مجھے باری علیک کی زبانی ایک ایسی بات معلوم ہوئی کہ میں حیرت میں ڈوب گیا۔

ہو نہ لگا رہا مسکن دہلی کے ایک ہندو علاقے میں تھا۔ جب ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے مذاقوں کو آگے بڑھا رہے تھے تو ان کا منہ بھی بند کر رکھ کر گیا تھا۔ وہ ان کی پیشانی پر کوئی شکن نہیں بکھری تھی۔

جب اٹھان کے چہرے پر سکراہٹ صید ہوئی تو وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مصائب سے بے پردا صرف دو رو کے مستقبل کے بارے میں پریشانی کا اظہار کیا کرتے تو وہ صرف دوسروں کے مصائب ہی سے نہیں اپنے مصائب سے بھی بے نیاز ہوتے تھے۔ انہوں نے اردو کے غم کو امتیاز کیا تھا۔ بانی عام غموں سے بے نیاز ہو گئے تھے۔

ان کی بڑی دیکھنے کا اتفاق صرف ایک بار ہوا۔ مذاقات کے زمانے میں میرے سوالات میں فرق نہیں آیا تھا۔ میں سلاٹنڈ گدا کی دوکان پر جا کے بیٹا رہا اور سلاٹنڈ کے رستورائوں میں کھانا کھا تا رہا۔ سلاٹنڈ آواز گدا کی کاسٹلر بھی جاری تھا۔ ایک ایک بات تقریباً ایک بجے، بال و دو کے کسی رستورائے سنبل

کو کر کے طرف آ رہا تھا اور نشے میں دھت تھا۔ نیا گندہ کے قریب پہنچا تو اس نے سے بڑی نیکی اور مودہ مودہ طرح دیکھ کر آئے دکھائی دیے۔ قریب یاڑ سونا سے نیچے آٹے ہاتھوں میں لایا جو کچھ فراہم کر سکتے تھے کہ وہ اس چٹائی پر بیٹھیں کی اس کے بعد ہی علیک کے ٹھکانے پر چھوڑ گئے۔

دوسرے دن بھی ملاقات ہوئی تو سونا یاڑ ہم تھے اور جب تک میں نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اب رات کے وقت گھر سے باہر نہیں نکلا کروں گا ان کے چہرے پر سکراہٹ واپس نہیں آئی۔

پہلے دھلی اور شاہنواز آباد پہنچے تو سارا ہندوؤں کے مستقبل کو ٹھنڈا پڑا۔ زندہ وہ بھی شہر نے اپنے سارے مسکین اور مذہبی اختلاف فراموش کر دیے اور جیک آواز بکرا اٹھے:

لال تلے سے آئی آواز

سہل کا دھلی شاہنواز

ہندوستان کے سماج چند برس کے فزاد میں حکومت کے قیام اور ان کے جذبہ ہم جوئی کے علاوہ اس بات کو بھی دخل تھا کہ گاندھی جی نے انہیں صفر کی اس منزل تک پہنچا دیا تھا کہ کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام دے بغیر وہ اپنے وقار کو بحال کر ہی نہیں سکتے تھے۔ جس شخص نے گاندھی کی پوری کمالات کو لکھ کر سنا اس کی بے بسی میں تلک بھی کس نے مرن پر ت رکھا تو ہندوستان میں کسی کے کان پر جوں تلک نہیں رہی غفلت و شہرت کی جڑوں پر پہنچنے کے

بہرہ گزیر چکر کے کوئے میں بیٹھا جان انسان نہیں جو نہ سوسہ سوش چند دوس نے رکھا
 بچی کھبا کر غفلت کا جو بار کی انھوں نے ہندوستان میں بار کسب سے ت
 باہر واکر میں ہیں۔

قرائن سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ ہندوستان سے باہر کسی پہنچنے
 سے طے شدہ منصوبے کے تحت گئے تھے جو منوں اور دیاپاٹیوں سے اس کی
 سائنس کا نقطہ دید میں ہوتا۔ اس کی پہلی کوشش یہ تھی کہ وہیں تک رسائی حاصل
 کی جائے۔ بہر حال ابتدائی محاولات خود کچھ ہی دور تک چلے گئے تھے۔ ہندوستان
 پہنچ کر انہیں فوج منظم کرنی تو ان ہندوستانوں کی نگاہ میں تھیں انگریز
 فوجی نے ہر ایک دہ سے بیگانہ کر دیا تھا وہ ہر ضرور رہ گئے۔

گوریلوں کی شکست کے بعد آٹھ روزہ رہے تو ایک لشکر قریب کی
 حیثیت سے کاغذس کی پروہنگی نہ منسخری ان کے خلاف حرکت میں ضرور آئی تھیں
 جب گوریل شکست کی منزل سے گزر رہے تھے دایک ہوائی حادثے میں ان کا
 موت ہو گئی اور ان میں سوش چند دوس کا گھر اس کے حریف نہیں بلکہ بہتر حریف
 تھے جو کہ کارہوں کو بیکار کا گھر اس اپنے اقتدار کی عمارت کو سنبھال رہے تھے۔

آزاد ہند فوج کے بہت سے ارکان حکومت برطانیہ کے غلام ہندوستانی
 فوجی اور سرورسپا ہی تھے جو غوریلوں کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بعد خود کار
 کر کے گواہ رہے ہیں تھے۔ گوریلوں کی شکست کے بعد یہ بھی رہا تو ان کی شکست
 کی وجہ یہ ہیں اسے فوج کے خلاف، شہنشاہ کے خلاف بغاوت کے غلام ہیں

مقات نام کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور ان مقامات میں سب سے زیادہ شہرت میں
 مقدس کے کہانی جو بنگلہ دھولوں اور شاہیناز کے خلاف لال قلعے میں مقیم۔
 وہاں کے مقامی میں چند تھیں جو ہر حال ضروری خاں تھے۔

ان جنہوں کو حرم قید کی منزل ہوئی تھیں یہ صرف شاہیناز کے خانہ بڑی تھی۔
 کیونکہ کمانڈر انچیف نے اپنے خصوصی اختیار سے حاکم کو فورا ہی سونخ کر دیا۔
 شہرت انھیں مشرق کے دروازی میں ہی رکھی گئی تھی۔ اس باغی جبریت نے فوج سے
 نصف انہماک تک ہٹا دیا تھیں کے کیوں بنگالی اور بنگالی اپنی زندگی کے
 لیے شہرہ دار کے استقبال میں گرسلا رہے ہو۔ پاگ پور گیا تو اس میں جبریت کی
 کوئی بات نہیں۔

آزاد ہند فوج میں خاں جوئے والوں میں بڑے دو کے سپہرہ آفرین اور
 کے غرض نہ اس میں تا دیر تک تھے جو شاہیناز کی کارروائی کے مصلحتوں سے گوریل
 بہت پہلے لاہور آچکے تھے اور کسی خاص جنگ سے کے سپہ سالار کے سپرد
 ہوئی تھیں۔ ان کا دور سے تقریباً ہر روز ملاقات ہوتی تھی۔ ایک روز فریڈ نے گئے
 کی گرسنگی، دھولوں اور شاہیناز نے ان سے ملاقات کا ارادہ ہو تو انھیں
 کے توسط سے انتظام کیا گیا جاسکا ہے۔ میں نے کہا دوست! اتنی بھی جلد ہی
 کیا ہے ان سب سے کچھ دن کے بعد میں ملاقات ہو کر کہے گا۔ بعد کے واقعات
 نے جاوید گریز کی بات اگر عقلاً نہیں تو سنا ضرور۔ دست تھی، انھیں جو شہرت
 ملی تھی وہ بھائی تھی اور بھائی شہر میں زیادہ تر قائم نہیں رہیں۔
 اس کے لئے کو سب سے پہلے بنگلہ نے سکھانہ وہ ایک سول ہندو گھرانے کے

جسم و چار فاضل اور چلتے تھے کہ ہندوؤں میں دو قیادت آسمانی سے تھیں
 ایک انھوں نے آزاد ہندوؤں کی ایک طاقتوں سے جو رانی جھانسی کے لقب سے
 مشہور ہو گئیں تھیں، شاہی کرلی اور کاروباری آدمی بن گئے۔ ڈھونڈ سکے تھے
 اور سکھوں میں بھی قوم پرست ہندوؤں کی کچھ کی نہیں تھی۔ انھوں نے بحری سیاست میں
 غور و فکر کیا لیکن قیادت کامیابی با تھ نہیں یا ایک شاہنواز کاسٹارہ قیادت
 چکا اور صرف اس لیے کہ اوں کو سلا اقتدار میں قوم پرست لڑے رکھ نہ زیادہ تھے ہی
 نہیں اور جس تھے ہی اہل فتنہ اور کی مکمل کھلی جا رہی تھیں اور وہ کیے بعد
 دیگر سے قوم پرست تھیں کو چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہو رہے تھے۔
 سر محمد القادر رٹا کر پھر بھی فروکش تھے جیسے کہ پہلے لکھا جا چکا
 ہے ان سے ملاقات کا شرف کبھی اپنی دلی زندگی کے آغاز میں حنیفا
 جالندھری کے توسط سے حاصل ہوا تھا اور پارٹیاں کو اب کو پیشہ
 بنانے میں ان کے مشورے کو بھی دخل تھوڑا یا ضیافت سے مراسم بڑھے توہل
 میں آئی کہ سر محمد القادر سے پہلی ملاقات کی تجدید کی جائے چنانچہ شام
 کو کچھ گلی میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے لگایہ ملاقاتیں میرے لیے بڑی
 ہی جیسریت افروز ثابت ہوئیں اور تاسک ادب کے ایسے کئی گوشے ظاہر
 ہوئے جو تصور بہ دلچسپی میری نگاہوں سے ہمیشہ غنی رہتے۔

لیکھ ملاقات میں انھوں نے ڈاکٹر تپالی کی زندگی اور ان کی شاعری
 کے پس منظر پر روشنی ڈالی اور ایسے کئی نکات بیان فرمائے جو
 شاعر میں اقبال کی نگاہوں سے اس وقت بھی غنی تھے اور اب بھی

غنی ہیں۔

مثال کے طور پر اقبال کے اس قلم کو جس کا آخری خیر ہے:

مگر سرکار نے کیا خوب کو نسل ہال جو آیا

کوئی عکس نہ تھا اس خیر میں سراپہ واروں کا

عام طور پر جمہوری نظام کا فکری استوار قرار دیا جاتا ہے حالانکہ یہ قلم
 انھوں نے کو نسل کے انتخاب میں شکست کھانے کے بعد لکھا تھا
 اور انتخاب میں ان کا کھڑا ہونا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ نگرانی سطح
 پر انتخابی بات اور جمہوریت کے مخالف نہیں تھے۔

اسی طرح اقوام متحدہ کے متعلق ان کا ایک نازکی قلم ہے جس کے
 آخری دو مصرعے ہیں:

من ازین پیشی مذاہم کہ گفتن دزدان چند

بہر قسیم قسیر را بختے ساختہ اند

اس دیکھی خارجہ میں اقبال نے استدلال کی ایک عبارت کوڑی کر لی ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس شخص میں ہندوستانی فائدہ نامزد ہونے کے
 لیے اقبال نے بڑی ہی کوشش کی تھی۔ فرقہ ڈال ان کی بجائے
 سر محمد القادر کے نام لکھا تھا انھیں اس پر کٹن چرووں کی انہیں گناہ گزینے لگا۔

ان کے اس شعر:

جو بے نامہ بھی پڑتے ہیں نامہ اقبال

بلا کے دیر سے کچھ کو نام کرتے ہیں

کے پیچھے بھی ایک حکایت ہے۔ یہ غازیست میں بڑی جمنی تھی، اقبال ہاست
کی اس ناکائے بیٹے تھے لیکن یہ تاقی سرحد الغار کے تھے۔

اقبال کے دو ترانے بہت مشہور ہیں ایک وطنی اور ایک قومی:

سامنے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا

ہم ٹیلے میں اس کی یہ نگستاں ہمارا

اشعار

چیں درپ ہمارا ہندوستان ہمارا

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

ان دونوں ترانوں کی نظریاتی اہمیت پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن

سرحد الغار کا ارشاد تھا کہ یہ دو ترانے ہی ترانے فرما سکتے تھے۔ پہلے ترانہ

اقبال نے قوم پرستوں کی فرمائش پر لکھا تھا کہ اس کا پہلا مصرعہ جس قومی

ترانے کا لفظی ترجمہ ہے، صرف جمنی کی جگہ ہندوستان کا لفظ رکھ دیا گیا۔

اس ترانے کو شہرت ہوئی تو کثرت بہت دو سونوں کی طرف سے ترانہ ملی کے

تھانے شروع ہوئے، اقبال نے انھیں بھی پورا کر دیا۔

۱۹۳۵ء کے ان آخر میں عام انتخابات ہوئے تو یہ اظہار من افسوس تھا

کہ پنجاب کی مسلم سیٹوں پر مسلم لیگ کو شکست دینا تو کجا کانگریس کا نتیجہ نہ

مردنک اس کا مقابلہ بھی نہ کر سکے گی، انتخابات سے کچھ پہلے پنڈت جواہر لال

نہرو نے ہندوستان کا دورہ کیا، تو پنجاب بھی آگے، اپنی پریس کانفرنس

میں انھوں نے کہا کہ کانگریس زیادہ سے زیادہ سیٹوں پر مسلم لیگ کے مقابلے

میں مددگار کھڑے کرے گی۔ ایک مسلم اخبار کے نمائندے کے اس سوال

پر کہ جہاں پہلے کانگریس سرحد پر مقابلہ کرنے کی بات کرتی تھی وہاں

اب صرف زیادہ سے زیادہ سیٹوں پر مقابلے کی بات کیوں کر رہی ہے اور

یہ کہ کیا اس سے کانگریس کے موقف میں تبدیلی کا پتہ نہیں چلتا؟ پنڈت جی غاموش

ہوئے، یہ سکوت بے سبب نہیں تھا، پنڈت جی جیسا زیرک سیاستمدان

تھیں اس سے بے خبر کیسے ہو سکتا تھا کہ یہ زیادہ سے زیادہ سیٹوں پر مقابلے

کی بات بھی براے نمون ہی تھی۔

مسلم لیگ کے مقابلے میں کانگریس کے احساس بے بسی سے فائدہ

پنجاب کے اخبار میں کو بیٹھا، انھوں نے کانگریس کی ور پر وہ حمایت اور رجحان

پہنچے اور حمایت کیا، اس کی پوری دنیا میں خبریں آتی تھیں حکومت الہیہ لاہور و ملتان

کیا حکومت الہیہ کے حقیقی مضبوطی کا علم تو حار یوں ہی کو ہو گا لیکن لفظ صبر

اس لئے کہ انتقد یہ تھا کہ صرف پنجاب ہی انھیں بلکہ پورے ہندوستان میں

ایک ایسی حکومت قائم کی جائے جو اسلام شریعت کی خود بھی پابند ہو اور دوسروں

سے بھی ان کی پابندی کرانے، خاص ہے کہ مسلمان اپنی تمام تر خواہ و موہی

کے باوجود ایک ایسے مقصد کے لیے جس کا حصول صرف اس وقت کے

حالات ہی میں نہیں ہو سکتا، قربانی بھی مشکوک تھا، اپنے فوری سیاسی

مقاصد کو فراموش کر کے بے نیاز نہیں ہو سکتے تھے، لہذا اس غم سے

احادیثیہ رگوں کی گرم باز میں تو ہونی لیکن کوئی مثبت سیاسی نتیجہ

نہیں نکلا

احرامی اپنی انتہائی تقریروں میں زیادہ زور اس بات پر دیتے تھے کہ مسلم لیگ لیسٹڈ اور کارکن شہداء اسلامی سے بچنا چاہیے اس مسئلے میں علی گڑھ پر جو دس سنی کے وہ طلباء جو مسلم لیگ کی مدد کرنے پنجاب پہنچے تھے ان کے بعض خصوصی تھے۔ ان طلباء کے بارے میں انھوں نے طرح طرح کی باتیں منسوب کر رکھی تھیں یہ سنی میں سے ایک یہ بھی کہ جلسوں میں جس کتاب پر ہاتھ رکھ کر وہ سیر کرتے ہیں وہ قرآن پاک نہیں بلکہ دانشنوی اہل حق ہے عجیب بات یہ بھی کہ ان طلباء کی غیر سنی اور دوزیر اس جسم کی طعن تشنیع کرتے وقت احرامیوں کا بوجھ صرف مذہبی ہی نہیں بلکہ عام اخلاقی حدود سے بھی تجاوز کر جاتا تھا۔ مثلاً ان لوگوں کی کسب اور ان کی خوب روٹی کا ذکر وہ چھٹکاتے تھے کہ کو کیا کرتے تھے۔

احرامیوں کی اپنی حرکات بھی انھیں ڈوب دینے کو کافی تھیں لیکن بخیر کیا بہت جو کسر تھی وہ ہندو اخبارات کی تائید سے پوری کر دی اس وقت کے متعلق ماحولی میں کوئی سسٹن ان یہ باور کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا کہ جس بات کو ہندو مسلم لوگوں کے لیے مضحکہ خیز تھی وہ واقعی ان کے لیے مضحکہ خیز ہو گی۔

انتخابات میں احمدی ناکامیوں کا جو حشر ہونا تھا وہ ہمارا لیکن ایک احمدی ایسا غرور تھا جو لینے کو آگ لگا تھا لیکن ان کی پیٹنبرری، شخص جو عرف عام میں ذریعہ کھلا تھا اور جس کا اصل نام دزیر محمد تھا، ایک

خود ساختہ انجمن کا صدر تھا، جس کا نام انجمن اصناف چار سو جی اے تھا۔ لاہور کی شہری سیٹ سے اس نے بھی تفریحاً اپنے کاغذات نامزدگی نکال کر دیے۔ اب کہ خدا کا یہ ہوا کہ اس سیٹ سے مسلم لیگ کے سرکار علی امین دار کے کاغذات نامزدگی نامعلوم چھ گئے اور کسی ناخوش امیدوار نے اس کی طرف سے اپنے کاغذات داخل کیے نہیں تھے۔ سیٹ اپنے ہاتھ سے نکلتے دیکھی تو مسلم لیگیوں نے اسی ذریعہ کی طرف رجوع کیا اور اس پر طعنہ دے کے ساتھ کہ کسی کھونا سک بھی کام آجاتا ہے۔ ذریعہ کو یہ بات سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ چار سو جیوں کی اصناف تو جہد میں بھی چڑھ سکتی ہے اس وقت سے منقطع سے فائدہ اٹھا کر اپنی ولایت ہی کو بہتر بنانا چاہیے۔ چنانچہ ذریعہ کا عرف ختم ہوا اور صاحب معزز دزیر محمد بن کر مسلم لیگ کے سرکار علی امین دار چر گئے اور انتخاب میں مقبول اکثریت کے ساتھ جیتے ہوئے۔

انتخاب کے نتیجے میں مسلم لیگ پنجاب اسمبلی میں سب سے بڑی پارٹی تو بن گئی لیکن اسے واضح اکثریت حاصل نہ ہو سکی شہری نشستیں مسلم لیگ اور کانگریس میں تقسیم ہو گئیں مسلم نشستیں مسلم لیگ کو ملیں اور ہندو نشستیں کانگریس کو لیکن دیہات میں کانگریس نشستیں تھیں مسلم نشستیں کچھ شامل تھیں، این اینٹ پارٹی کو بھی مل گئی تھیں اس طرح اپنی قوت کے پورے مقابلہ سے کے باوجود قائد احمدی مسلم لیگ کے ہاتھ ذریعہ اور سرخضریات خاں کی قیادت میں این اینٹ پارٹی اور کانگریس کی ملی جلی وزارت برسرِ اقتدار آگئی۔

یہ بات یاد رکھانی آداب کے معانی میں ہرگز نہیں تھی لیکن مسلم لیگ کے

لیڈروں کے مزاج کی ان دونوں کیفیت تھی، اس کے ضمنی نظریہ قریح خلک ہی
 سے کہ جاسکتی تھی کہ وہ پارلیمانی آداب کا اس سنگ استزمام کریں گے کہ
 اقتدار سے محروم کی گئی ہو کر رہیں، خواہ اس طرح کے ساتھ ہی بھی لیکن مسلم لیگ
 لیڈروں کی طرف سے یہ بات ایک سے زائد بار بھی جاتی تھی کہ ہندوستان
 کے ان حصوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، اقتدار کی کشمکش صرف
 مسلم پارٹیوں تک ہی محدود رہی، غیر مسلم و ہریانہ کے غائبہ اکثریت کشمکش
 اقتدار میں شرکت کریں تو یہ ایک طرف سے عدل و برابری کا حق دینے والی
 بات ہوگی، انھیں تو اس کشمکش کا خوش قسمت بننا چاہیے، تاہم عظیم تو
 سر سے جمہوریت کا کوہ ہندوستان کے لیے نامزدوں قرار دے چکے تھے
 ہندو پنجاب مسلم لیگ نے فیصلہ کیا کہ اقتدار کی جو بازی وہ اسٹیبل میز پر لگتی ہے
 اسے پنجاب کے کوچ و بار بار میں جیتا جائے۔

پنجاب مسلم لیگ نے مغزو وزارت کی بھڑائی کے لیے مولانا فاضل کی توجہ
 تحریک چلائی وہ بیرونی طور پر پرامن رہا، اس میں صوبائی لیگ کے لیڈروں
 کی تنظیمی صلاحیتوں کو بھی دخل تھا، لیکن ایک باعث یہ بھی تھا
 کہ اس تحریک کو سرگرم مزاحمت کا سامنا ہوا ہی
 نہیں، نہ حکومت کی طرف سے اور نہ کسی اور
 جانب سے۔

صاحبان وزارت کی طرف سے کوئی جوابی تحریک چلائی جاتی تو بہت
 ممکن تھا کہ حکومت دونوں پر سختی کر کے اچھا سنگ تمام کر سکتی لیکن صرف

مسلمانوں کے خلاف کارروائی کرنے کا حوصلہ سرخضریات میں نہیں تھا،
 پھر انکی سطح پر بھی کچھ ایسی باتیں ہو رہی تھیں جو خضریات کی وزارت کے
 لیے سازگار نہیں تھیں، پاکستان کا قیام یقینی نظر آنے لگا تھا، اس
 صورت میں برسرِ اقتدار رہنا نہ خضریات کے لیے مفید تھا اور نہ انھیں
 برسرِ اقتدار رکھنا حکومت ہند کی مصالحتوں کو بے جا کرنا تھا، چنانچہ انھوں نے
 استعفا دے دیا، یہ اور بات ہے کہ مسلم لیگ کی وزارت پنجاب میں ان کے
 استعفیے کے بعد بھی نہیں جاتی اور وہاں گورنر صاحب قائم ہو گیا۔

پکا ایک اسٹریٹا نارنگ کے دل میں آئی کہ ان کے لیے کچھ کر کرنا
 ضروری ہے، انھوں نے ہندوؤں اور سکھوں کے ایک ہیٹ بٹے جیسے
 میں اپنی کریاں کو بہنہ کیا اور ہندوؤں اور سکھوں کو متورہ دیا کہ ان کے
 لیے کچھ کرنے اور مرے کا وقت آگیا ہے، ان کی تقریر کے بعد ہندوؤں
 اور سکھوں کا ملبوس جب انارکلی سے گزر رہا تھا تو رات ہو چکی تھی، در
 میں دفتر سے اپنے گھر لوٹ رہا تھا، ہجوم و امن مشتعل تھا، راتے میں جہاں
 کچھ بھی مسلم لیگ کا جھنڈا نظر آیا انھوں نے، جیسے جیسے مارا جھنڈا و غپا
 ہوتا تو اس تک رسائی کے لیے ایک شخص دوسرے شخص کے کاندھوں
 پر سوار ہو جاتا اور اگر کچھ بھی کام نہ چلتا تو جھینڈے کو اتارنے کے
 لیے کریاں استعمال کی جاتی، صاف ظاہر تھا کہ لاہور کا سکون اب
 برقرار نہیں رہے گا۔

بالی بہت سی چیزوں کی طرح مسندوں نے فسادات کو بھی کافی دھول
بکھیر چھتی تھی سمجھا جیسے ہی کسی گلیہ بیکری میں داخل ہوتا باری خرونگھٹے:

کافرا یا پھر ہی نکالو

فسادات نے انتہائی زور رکھا اور کئی امارتیں کا علاقہ مخصوص نظر میں
لے لگنے بیکری کی محفل پر ہم نہیں ہوتی۔ امارتیں میں فساد مذہب نے کی وجہ
تھی کہ وہاں کے ہندو اور مسلمان دو کا ڈاروں میں سمجھوتہ ہو گیا تھا کہ بازار کو
قہر نہیں ہونے دیا جائے گا۔ چنانچہ جب بالی خبر ملے رہا تھا، تب بھی امارتیں
پر آتش نہیں لگائی۔ کاروبار اور سرمایہ کی مصلحت تھا اور کھانے پینے کی رچاؤ کا
دکانوں کو چھوڑ کر کوئی دکان کھلی نظر نہ آتی تھی۔

ایک دن دوپہر کو میں گھر میں بیٹھا ناخ کھیل رہا تھا کہ کسی نے اطلاع
دی کہ آتش زنی اور غوث مار کا سلسلہ امارتیں میں بھی شروع ہو گیا ہے کچھ
خندے دم بولا مذکورہ مکان کا جو میرے گھر کے قریب ہی تھی، اٹا توڑ رہے
تھے اور آگ لگانے کی کوشش بھی کی جا رہی تھی۔ دن دنوں ناگہر جیسے
اور پولیس کی مدد حاصل کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے یقینی نظر نہ تھا کہ اگر
آگ لگ گئی تو سامان باطل کر رہ جائے گا۔ لیکن گورکھ کی مشہور دکان جہاں
ایک منزل کے مالک کی حکام رہتے تھے آگ لگی۔ اس نے سبز شدہ ٹٹ پائس
کو جو ایک ٹکڑی تھا، براہ راست ٹٹلی فون کر دیا وہ کچھ سیارہ بول کر کہنے کو
جائے واردات پر پہنچا اور اپنے ہاتھ سے شعلیں جگمگ چلا کر تین فسادوں کو
چاک کر دیا باقی سماج کے ناگہ انتہہ لگ چکی تھی لیکن یہ بھی جلدی نہیں

اور جو واحد دکان علی وہ کسی ہندو کی نہیں بلکہ مسلمان کی تھی۔
فسادوں کی آغوشیں لگنے دی گئی ہمارا سماج میں پڑا ہی رہیں، شاید بنگو
کو عبرت دہانے کے لیے فیملی ماحضیں نکلے طبقے کے مسلمانوں کی تحقیر
جو ہمس اور وضع قطع سے چنیے در فسادے معلوم ہوتے تھے۔

امارتیں کو چھوڑنے میں ایک انگریز افسر کی تنہا بہادری کو دخل تھا
لیکن یہ بات بہ متور ذہنی جاتی رہی کہ فسادات انگریز کر رہے تھے۔

امارتیں کے دکانداروں کا سمجھوتہ اس واقعے کے بعد بھی برقرار رہا اور
خنجر زنی کے کانڈاکا واقعات کو سمجھوڑ کر یہاں فساد نہیں ہوا۔ ہندو
بہر حال بے ہوش تھے اور اس سکون کو آنے والے طوفان کا پیش خیمہ
سمجھ رہے تھے۔ فسادات کی درپردہ تیاریوں کا سبب ایک مسلمان رئیس
کے بچوں پر تھانسی کی امارتیں میں کافی جانا پڑا تھا۔ ان میں سے ایک کبھی
کبھی گلیہ بیکری میں بھی آتا کرتا تھا۔ اس واقعے کے دو تین دن بعد ملاؤ بکنے
لگا، مقل صاحب کھنڈ شائع چائے گھر چل کر ہی پہنچیں ہیں ساتھ ہولناکی
لوگوں کی کوٹھی بہت بڑی تھی اور خود اس کا کمرہ اوپر کی منزل پر تھا جہاں
پہنچنے کے پہلے نہ بچوں کو بار بار تار تار تھا۔

کمرے میں پہنچتے ہی کہنے لگا: تم جانتے ہو کہ میں تمہیں یہاں کیوں
لایا ہوں؟ میں نے کہا: اتنی گرنے کے لیے۔ میرے جواب پر نہیں بڑا اور
چپختی اس کی دلی مسرت کی، جینے وار تھی۔ کہنے لگا کہ میں خوش ہوں کہ
گمراہ ایک ہندو بچے ناگہ نہیں سمجھتا میں تمہیں یہاں آج اس لیے

ایسا تھا کہ اپنے دل کا راجہ بنا کر دیں۔ یہ بتاؤں کہ مجھ پر فساد کی وجہ سے یہ تیار ہیں
لاجر ازام ہے نہ غلط ہے۔

انارکلی پڑ سکون کہی لیکن اندرونی فیصل قیامت کا عالم تھا وہ ہندوؤں کے
بازار کیے ہندو عورتیں جلانے جا رہے تھے جب تک ہندوؤں کو یہ خیال نہ ہو کہ
لاہور ہندوستان ہی میں رہے گا وہ وہاں ڈلے رہے ہیں جب لاہور کے
پائے میں فیصلہ ہو گیا کہ وہ پاکستان میں جانے کا قانون کے قدم اٹھ گئے پھر
انجی سٹیج پر غولہ حضرت علی ہی کی تیار آنا وہی کا فیصلہ ہو گیا اور جانے والوں
کے لیے ہر کام کی فکر نہ کیا کہ یہ کس نام ہندوؤں کے وہاں پہنچے گا سوال یہی تھا۔

میراٹھنا بیٹھا پھر کہ زیادہ تر مسلمانوں میں تھا اس لیے وہ مسلمان
جو میرے ذاتی دوست نہیں تھے مجھے مسلمان ہی سمجھتے تھے اور ایک بار ایک کلب
مصر میں حال پیدا ہو گئی۔ ہمارا گشت کر میں انگلیٹ، بیکری میں سب کا اشتراک
کر رہا تھا اور غفلت ہی ہوئی تھی کہ ایک دو تین غفلت سے صورت مسلمان
داخل ہوئے اور ہمارے میسنر کے قریب ہی بیٹھ گئے پھر جاری گفتگو
میں ہی مشرک ہو گئے اور اپنے فکر و فطرت گری کے کارٹلے ناخدا
انداز میں مسلمانے گئے ان میں سے ایک خصوصیت سے میری طرف
مخاطب تھا اور ایک گروہ دار سے پر تلے کی روئے دست نہ ہوا اس کا کہنا
تھا کہ گروہ دار سے والوں کے پاس اسلحہ لائی تھا اور وہ اپنے بچاؤ کے لیے
مقاومت کو تیار ہیں جاتے رہے لیکن گولیاں آخر ختم ہو گئیں جس کے بعد وہ اور
اس کے ساتھی دلچسپ پناہ نہ کر رہا اس کے اندر گئے اور سکھوں کو ایک

ایک کر کے زندہ کر ڈالا۔

خدا جانے اس کا باعث میرا اپنے مسلمان دوستوں پر کامل اعتماد
تھا یاد دلانگی کی کوئی ترنگ کہ میں نے اسے بتا دیا کہ سب شخص گروہ اپنی
روئے دست نہ رہے وہ ایک ہندو سے اس کا جو تواریک بدلیا گیا کہنے لگا
کہ اگر یہ سوں تم سے ملاقات ہوئی تو میں تمہیں ضرور قتل کر دیتا لیکن کل
پاکستان قائم ہو گیا ہے اب تم میرے بھائی ہو میرے گھر میں
تمہاری تواضع کروں گا اور اگر کوئی تم پر ناگلی غلطی کا تو اس کا سر کاٹ
دوں گا اپنا خانی سے نکالو اس نے مجھے کچھ گوسپاں بھی دکھائیں کہنے لگا
یہ ان میں سے چست نہ گویاں ہیں نہ حصار سے چالی بہت دہم پر چلائے
سہہ رہی۔

قلندریوں پر نجات کا صرف اتنا فرق تھا کہ اب میری آمد پر
باری علیگ کا نر یا پھر ہی نکالو کا غور و جہت نہیں کرتے تھے صرف
ذاتی بنائے کا دھمکا دیتے تھے میرے میں کیا کرنا تھا ابے چلی تو خود کسی
قاب مددوٹ کا کبیر لگا چوٹی کی ابھی قائم تھی کہ جو ہندو بھاگے آئی ہیں
والس کا جو میں لگا رہا پھر ویسا کا ویسا ہی رہے گا۔

لیکن اس خوش فہمی نے زیادہ دن ساتھ نہیں دیا۔ لاہور سے ہندو
بھاگ آئی نہیں رہے تھے وہاں سے مسلمان آگئی رہتے تھے۔ لاہور کا نقشہ
یکسر بدل رہا تھا ابے ذی بننے کی دھمکا دینے کی بجائے باریکا
اب اپنے اس ڈر کا غلبہ رکھنے لگا تھا۔ پار مشن کہیں دواویسی نہ

رکھنا پڑ جائے۔
 فسادات عظیم تھے یاخوردی اس مسئلے میں طرح طرح کی
 قیاس مارا تھا کہ نہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ فسادات اس لیے شروع
 ہوئے کہ اگر سر کے بدعنوانوں نے لاہور کے بدعاشوں کو چڑیاں بگڑ گئی تھیں
 کہہ کہتے تھے کہ فسادات کی تنظیم مسلم لیگی لیڈروں نے کی ہے لیکن بعض یہ بھی
 کہتے تھے کہ لوہ موٹ لکچر کے دوسرے مسلم لیگی سپر سرجر جاکر ان کی بیک باگ
 ہے یہ کہہ کر ملکا کہ وہ تو ان ہی باتیں سمجھتا ہوں بشرطہ شروع میں غلوں
 نے فساد کو پروان چڑھا دیا اور جب فساد کی حد سے تجاوز کر گئے ہوں تو انہیں
 باز رکھنے کی کوشش کی جو پھر حال بہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ اگر فساد
 عظیم ہی تو تھی تو ان کا قول اور اسے مکانات کو جیسا یا انہیں بار بار بہت جوہر ملتا
 پاکستان کا نشانہ تھے۔

فساد یوں نے اس کے سنی جس میں ہر دھیسریع ڈاکٹر جیسے تھے حملہ
 کیا تو انہوں نے ہی دھیل دے کر فساد یوں کو آتش زنی اور تھک و فارت
 سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔ کہتے ہیں کہ پہلے فساد کی ہر دھیسریع صاحب
 کی بات مان کر دہلی چلے گئے، لیکن وہی خود یا فساد یوں کی کوئی دوسری لڑائی
 دوبارہ آئی تو پھر دھیسریع صاحب نہیں چل سکتے تھے، تاکام رہے اور سب
 سے پہلے خود ہی تھک ہو گئے۔

پھر دھیسریع ڈاکٹر نے ان کی غیرت کے باہر اقتصادیات تھے۔ جہاں
 بیشتر ماہرین اقتصادیات یہ کہتے تھے کہ پاکستان اقتصاد کی طور پر کبھی

مستحکم نہیں ہو سکے گا اور اس کا وجود بر ملا ہی ناپائیدار ہے، وہاں ہر دھیسریع
 بھلا غلام نے اس نظریے کی حمایت میں متعدد مضامین لکھے تھے کہ پاکستان
 اقتصاد کی طور پر خود کفیل ہونے کا ادب ہو گا۔ وہ پاکستان میں رہنے
 کا فیصلہ کیے ہوئے تھے اور ان کی بے تعلقی کا کثرت سے کثرت مسلم لیگی
 قاتل تھا بہت ممکن تھا کہ اگر وہ زندہ رہتے تو پاکستان کے اقتصاد کی
 استحکام کا کام انہیں کے سپرد ہوتا لیکن قضا و قدر کو یہ منظور
 نہیں تھا۔

ان کی موت میرے لیے نہ بہت دور تھی۔ وہ میرے استاد
 تھے اور میرے مزاج کی تشکیل میں ان کا بڑا دخل تھا۔ گھر والے لاہور
 میں رہنے کے لیے مجھے بھی تیار نہیں تھے۔ اب میرے قدم بھی ڈنگا گئے
 اور جب امرتسر جانے والا لاہور کا آخری قافلو روانہ ہوا تو اس میں میں بھی
 سوار تھا۔ مجھے الوداع کہنے کے مسلمان دوست گھمائے تھے۔ ان میں سے
 دو ایک کی آنکھیں، اشکبار تھیں، ایک مسافر نے سرگوشی کے انداز میں
 مجھ سے کہا: سارے پہلے مارا کر تم جگاتے ہیں پھر دتے ہیں مجھے غصہ
 آگیا اور میں نے کہا: بھگوت۔ یہ فیصلہ میں آج تک نہیں کر سکا کہ یہ
 جھوٹا میں نے اسے ڈھالی تھی یا خود اپنے آپ کو۔ کیونکہ دل اندھی اندر
 کہہ دیا مومن کو کہ تم جھگڑا میں کھستہ دل کو ٹھیل دے کر جا رہے ہو۔

قافلو امرتسر پہنچا تو وہاں بھی مجھے ہر گئے مکان نظر پڑے۔ لاہور میں
 پیشانی پر نذر شہادت چہ انہیں ہوا تھا لیکن یہاں آکر نہایت کے قطرے

ضرور بخود رہ گئے۔

پتہ چلا کہ اسی قافلے میں راج بدوید راج بھی شامل ہیں۔ جہاں قافلہ
رکا تھا وہاں اچھا خاصا بازار لگا ہوا تھا۔ ہم دو نوں ہم سفر منہ دھو کر چائے
نوشی میں مصروف ہو گئے۔ قافلے والے ٹکٹ لٹا کر آئے تھے۔ لیکن یہاں
معلوم ہوتا تھا کہ ٹیکسٹ کے خود راں میں بھی موجود ہیں۔ کسی کا ٹکٹ فاسٹ
تھا کسی کا بستر۔ ہم اس پر طنز یہ آغاز میں تبصرہ کر رہے تھے کہ قریب
ہی سے آواز آئی: اب لاہور پہنچ کر ٹکٹ چلیں گے۔ میں نے پوچھا:
راج! ہم ٹکٹ کرنے کب جا رہے ہیں، کہنے لگا ابھی! ابھی سنا غرہ
پڑھنے چلیں گے۔

گوہاں مثل کا شعری مجموعہ

صحرا میں اذان

اردو شاعری کی مستحکم اور معتبر آواز

اعلیٰ گیسٹ اپ آفٹ کی طباعت

قیمت: چھ روپے

۱۹۷۰ء کا نوبل پرائز پانے والے روسی ادیب

ایلیگزینڈر سولنٹین کا شاہکار

کینسر وارڈ

(اُردو میں)

ایک عظیم ناول جو روسی زبان کی ناول نگاری کی شاہکارِ روایت کو
اُسی نے کیا ہے۔

روسی کی موجودہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کا بھرپور نقشہ اُٹھا کر
مصنف نے ماضی زندگی کے بارے میں وہ بنیادی سوالات بھی اٹھائے
جو ابھی اُٹھائے نہیں ہوئے۔

اسی قریب کہ دو میں یہ ناول ہم نے شائع کیا ہے۔

مترجم: گوپال مشل

۱۵۰ صفحات ————— عمدہ گیٹ اپ

قیمت: آٹھ روپے

کلیاتِ اختر شیرانی

حداشب: گوپال مشل

اردو میں سچی رومانی شاعری کی روایت اختر شیرانی سے شروع

ہوتی اور انہی پر ختم بھی ہو گئی۔

یہ ایک ایسے صاحبِ طرز شاعر کا کلام ہے جو اپنی طرز کا واحد

بھی تھا اور خاتم بھی اور جس نے اپنی زندگی ہی میں غیر معمولی عظمت
حاصل کر لی تھی۔

گوپال مشل کے قلم سے ایک خیالِ افسرِ روز دیا چہ بھی

شامل کتاب ہے۔

عمدہ گیٹ اپ ————— مضبوط جلد

قیمت: پچھ روپے

کلیاتِ اختر شیرانی

حداشب: گوپال مشل

اردو میں سچی روحانی نشا اعلیٰ کی روایت اختر شیرانی کے شروع
ہوئی اور انہی پر غم بھی ہو گئی۔

یہ ایک ایسے صاحبِ طرز شاعر کا کلام ہے جو اپنی طرز کا مزید
بھی تھا اور غامض بھی اور جس نے اپنی زندگی ہی میں غیر معمولی عظمت
میں کر لی تھی۔

گوپال قتل کے قلم سے ایک خیال افسرہ دریا چہ بھی
شامل کتاب ہے۔

محمد گیسٹ آپ _____ مضبوط جلد

قیمت: پچھ روپے

